ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

ارشد محمود

دوسری اشاعت: 2009

زیر اہتمام
آج کی کتابیں

طباعت
علمی گرافکس، کراچی

سٹی پریس بک شاپ
316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 35650623, 35213916 (92-21)
ای میل: ajmalkamal@gmail.com

انتساب

فطرت کے نام
جس نے تمام لطافتیں پیدا کیں

فہرست

پیش لفظ: خوبصورتی اور خوشی کا مطالبہ

ثقافتی گھٹن کے اسباب پر ایک مختصر نظر

ثقافتی گھٹن کے اثرات اور مظاہر

حسن، عشق اور پسماندہ قوم

آئیڈیالوجی کی اسیر سوسائٹی

خوش ہونا منع ہے — یہ پاکستانی سوسائٹی ہے

عزت، غیرت اور شرم تلے عورت

سائنسی انقلاب اور کہنہ جنسی نظریات کا خاتمہ

مغربی تہذیب کو گالی کیوں؟

روایتی لباس — ترقی میں رکاوٹ

جنس اور سماج

ہمارا تہذیبی پس منظر اور جنسی اثرات

شریعت اور آئیڈیل عورت کا تصور

بہشت میں تنہا عورت

پردہ — عورت کی بحیثیت انسان نفی

مولانا مودودی کا تصورِ عورت

ثقافتی گھٹن کے اسباب

- علاقے کا تاریخی تجرد
- مذہب
- معاشی پسماندگی
- پدرسری نظام
- ماضی سے وابستگی
- تہذیب نو کے نقائص
- سیاسی نظام کے تقاضے

ثقافتی گھٹن کے مزید ذیلی اسباب

مذہبی رویے
غیر سائنسی رویے
فرد پر قدغنیں
غیر جمہوری سوچ
عورت پر پابندیاں
شرم وحیا کا تصور
وراثت کا تصور
قربانی نظریے کے لیے
مسرت پر پابندی (لہوولعب)
دنیا شر ہے
مادہ فساد ہے
ستر پوشی کا تصور
آخرت کا تصور

پدرسری نظام
عورت پر پابندیاں
آمرانہ سوچ
طاقت کا قانون
بیٹے کی ضرورت
ملکیت کا تصور
غیرت کا تصور

مشرقی سوچ
نفسانی عجز
ماضی پرستی
لوک روایات
انفرادی سوچ کی کمی
غیرت کا تصور
قربانی (دوسروں کے لیے)
جدیدیت سے بیر
متروک لباس سے لگاؤ

ثقافتی گھٹن کے مظاہر

کھل کر بات نہ کہہ سکنا
خوشی کا اظہار نہ کر سکنا
فطری تقاضے پورے نہ کر سکنا
حسن کی تلاش نہ کر سکنا
سائنسی رویہ نہ اپنا سکنا
نئے نظریات نہ اپنا سکنا
تہواروں کا نہ ہونا
فنونِ لطیفہ کا محدود رہ جانا

ثقافتی گھٹن کے اثرات

پس ماندہ رہ جانا
غیر عقلی رویوں کا فروغ پانا
مذکورہ بالا مظاہر کے تسلسل کا قائم رہنا

پیش لفظ

خوبصورتی اور خوشی کا مطالبہ

ہم نے اپنے ماحول اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس حد تک جامد، خشک، بور، بے کیف، حسن اور لطف سے عاری کر رکھا ہے کہ بحیثیت حیوان جن جبلّی خوشیوں پر ہمارا حق ہوسکتا تھا، یہ کہہ کر کہ ہم حیوان نہیں انسان ہیں، اُن سے خود کو محروم کر لیا، اور انسان ہونے کے ناتے جن خوشیوں پر حق ہوسکتا تھا انھیں یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہم انسان نہیں مسلمان ہیں۔ یہ ہے ہمارا ثقافتی المیہ۔ ہمارا شمار حیوانوں میں ہے نہ انسانوں میں۔ ثقافت نے حیوانیت اور انسانیت کے دائرے میں ہی رہ کر پرورش پانا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ہم اجتماعی طور پر حسن کے احساس اور خوشیوں کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کے بیری بن چکے ہیں۔ اب سنجیدگی کا مارا، تاریکی پسند اور جمالیاتی حسوں سے محروم انبوہِ کثیر، عالمی تہذیبِ نو سے اپنی ثقافتی، سیاسی اور معاشی دشمنی میں اضافہ کیے چلا جا رہا ہے۔ بربادی اور موت کی علامتوں سے اپنی شاہراہوں کو سجانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ خودساختہ اخلاقیات اور پارسائی کے خبط نے ماحول میں مُردنی، گھٹن اور بے کیفی اس حد تک پیدا کر رکھی ہے کہ اس کے اندر زندگی اور دنیا کو خوبصورت بنانے یا اسے ترقی دینے کی لگن اور دلچسپی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ایک طرف ہماری طاقت ور ایلیٹ (elite) حکمران کلاس ہے، جو حیوانی اور انسانی سطح کی سب جبلّی لذتوں سے بہرہ مند ہے۔ اس نے اخلاقیات اور پاک دامنی کے سب اسباق عام آدمی کے لیے رکھ چھوڑے ہیں، تاکہ عوام کے حصے کی خوشیوں پر قبضہ جاری رکھا جا سکے۔ دوسری طرف کروڑوں عوام کا وہ جمِ غفیر ہے جہالت اور غربت جن کا مقدر ہے، اور یہ مقدر اِسی طاقتور طبقے کا لکھا ہوا ہے۔ وہ خوبصورتی اور لذتوں کے بارے سوچ بھی نہیں سکتے۔ کسی بھی سوسائٹی کی ساری تڑپ، جدوجہد اور امید کی کرن صرف متوسط طبقہ ہوتا ہے۔ وہ کون سا انسان ہے جسے اپنے لیے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے خوبصورتی اور خوشیاں درکار نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں اپنے اوپر سے مسخ شدہ انسان کا چوغہ اتار پھینکنا چاہیے اور خوبصورت بننے، ماحول کو خوبصورت کرنے اور ہر ایک کے اپنے انداز سے خوش ہونے کے حق کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ اگر اس طبقے کی مزاحمت نہیں کریں گے جو ثواب اور پارسائی کے نام پر پورے معاشرے کو بلیک میل کرتا ہے، اُسے پیچھے رہنے، گھٹن زدہ اور بدنما زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے، تو ہمارے اس وطن میں تہذیب کے رہے سہے آثار بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی کاوش ہے۔

ارشد محمود

ثقافتی گھٹن کے اسباب پر ایک مختصر نظر

علاقے کا تجرد:

اس میں وہ عوامل شامل ہیں جو علاقائی نوعیت کے ہیں۔ یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا ثقافتی پس ماندگی ہمیں مشرقی، ایشیائی اور پھر جنوبی ایشیائی خصوصیات کی وجہ سے ورثے میں ملی ہیں؟ کیا وجہ ہے، عمومی طور پر جنوبی ایشیا کے سارے عوام اور خصوصاً اس علاقے کے مسلمانوں کے تصورِ کائنات (worldview) میں کشادہ فکری کیوں پیدا نہیں ہوسکی؟ مثلاً عرب مسلمان اتنے ثقافت دشمن نہیں ہیں۔ خاص طور پر صحرائے عرب سے باہر کے ممالک کے عوام رقص و موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ سماجی رسم و رواج میں بھی وہ کھلے اور لبرل ماحول کے حامل ہیں۔ مثلاً عرب مسلمان عورتیں کسی اجنبی مرد سے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کرنے سے نہیں جھجکتیں، جب کہ ہم برصغیر کی مسلمان عورتوں میں اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ عرب ممالک میں عام لوگوں کی خوشیوں کے حصول کی راہ پر سماجی پابندیاں نہیں ہیں، جس طرح ہم پاکستان میں دیکھتے ہیں۔ یوں لگتا ہے برصغیر کا اسلام دنیا بھر سے نرالا ہے، اور یہ عربوں پر نہیں، ہم پر اترا تھا! بنیاد پرست لوگ اور تحریکیں عرب مسلمان ملکوں میں بھی ہیں۔ وہاں بھی آمرانہ سیاسی نظام رائج ہیں، لیکن وہ ثقافتی گھٹن نہیں جو ہمارے ہاں ہے۔ بیشتر مسلمان ملکوں میں اقلیتوں کی حالت ہم سے اچھی ہے۔ قحبہ خانے، نائٹ کلب، گانے بجانے، ناچنے اور مخلوط محفلوں کا انعقاد عام ہے۔ لوگوں کی معصومانہ خوشیوں پر کوئی قدغن نہیں لگائی جاتی، جب تک کہ کوئی بات سچ مچ فحاشی کے زمرے میں نہ آئے یا فساد کا سبب نہ بنے۔ ہم برصغیر کے مسلمانوں نے ایک خشک اور بے کیف زندگی بنا رکھی ہے اور اسلامی معاشرت کا ایک ایسا تصور اپنایا ہے جو انسان رہنے دیتا ہے نہ حیوان۔ کسی عرب مسلمان قوم نے ریاست کو اسلام کا قلعہ بنانے کا اعلان نہیں کیا۔

بیشتر مسلمان عرب ملکوں کے ٹی وی کی نشریات ثقافتی طور پر اس قدر لبرل ہیں کہ ہم پاک و ہند کے مسلمان اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف ہمارا PTV پاکیزگی اور خاندانی اقدار کے نام پر دنیا کے ٹاپ کے رجعت پسند اور قدامت پرست نشریاتی اداروں میں سے ہے، جس نے سیٹیلائٹ نشریات اور گلوبلائزیشن کے زمانے میں حماقت پر مبنی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ آپ کے ٹی وی کی ساری پاکیزگی اور شرافت ریموٹ کنٹرول کا بٹن کوئی دوسرا عالمی چینل لگا کر ہوا کر دیتا ہے، لیکن اتنی آسان سی بات ہماری اخلاقیات کے خودساختہ گاڈفادروں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ پوری تاریخ گواہ ہے، برصغیر کے مسلمان خود کبھی نہیں بدلے، کبھی آگے نہیں بڑھے۔ ہم اس وقت تھوڑا سا بدلتے ہیں جب تاریخی قوتیں ہمیں بدلنے پر مجبور کر دیتی ہیں، اور زمانہ بہت آگے کو جا چکا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا اس خطے کی مٹی میں کچھ ایسی بات ہے کہ ساری دنیا بدل سکتی ہے، آگے کو دیکھ سکتی ہے اور آگے بڑھ سکتی ہے، لیکن ہم برصغیر کے مسلمان اپنے خودساختہ بُنے جال سے باہر نہیں نکل سکتے؟ ہماری تمام قومی، سماجی اور مذہبی فکر بوسیدہ ہو چکی ہے، لیکن ہم بے خبر ہیں، انسان کیا ہے، کیا بن چکا ہے، اسے کیا سے کیا معلوم ہو چکا ہے اور وہ کہاں جا چکا ہے۔ جن اقدار اور نظریات کو ہم سینے سے لگائے ہوئے ہیں، یہ تہذیب کے عجائب گھروں حصہ بن چکے ہیں۔ ہم جیسی اپنی خوشیوں اور ترقی کی دشمن قوم شاید ہی دنیا میں کوئی اور باقی رہ گئی ہو۔

مذہب:

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ہم مسلمانوں کی ثقافتی پسماندگی میں مذہب سے لگاؤ کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہمارے فلسفۂ حیات کی اُٹھان کچھ ایسی ہے کہ جمالیاتی اور ثقافتی اقدار اس کی ہٹ لسٹ پر سب سے اونچی جگہ پر ہیں۔ تہذیبی اور تاریخی لحاظ سے یہ ایک بدنصیب پہلو ہے جس پر مسلم

دانشوروں نے کبھی کھل کر بات نہیں کی۔ پوری مسلم تاریخ میں معتزلہ کے بعد کھل کر بات کرنے کی روایت پھر نہیں اُبھر سکی۔ اگر چہ لبرل اور جدید مسلم دانشور فنونِ لطیفہ کی کسی نہ کسی شکل کو اسلام میں ''جائز'' ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن سچ یہی ہے کہ اسلام میں فنون لطیفہ کی جگہ نہایت محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کے مسلمان حکمران اپنے فالتو پیسے کو زیادہ سے زیادہ باغات، محلات اور مزاروں کی تعمیر پر لگانے میں مصروف رہے اور جن فنون نے سب سے زیادہ ترقی پائی وہ geometrical designs تھے یا پھر خطاطی، جو زیادہ تر قرآن پاک کی آیات تک محدود رہی۔

موسیقی میں فوک (folk) زندہ رہا، اس لیے کہ اس کی جڑیں قوم پرستی اور زمین سے وابستہ ہوتی ہیں، لیکن مذہبی پیشوا بہر حال اس کے خلاف بولتے رہے۔ مذہب کی ثقافتی خشکی کے ردعمل میں اُن صوفیائے کرام نے موسیقی کو مذہب میں زبردستی ضم کر دیا جو مذہب کے بنیادی (شرعی) دھارے سے منحرف ہو چکے تھے۔ ملاؤں کا رقص و موسیقی کے بارے تصور (concept) لڑکیوں کی دف بجاتی ٹولی تک محدود ہے، ورنہ فنون لطیفہ کی شکل اسلام میں یا تو لہو ولعب ہے یا پھر شرک اور بت پرستی ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں فنون لطیفہ کی حالتِ زار اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بے چارے فن کاروں پر ترس آتا ہے کہ انسان کی جمالیاتی جبلّت کو اتنے نامساعد حالات میں کس طرح زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ محض دنیا میں مہذب کہلوانے کی خاطر منافق اسٹیبلشمنٹ نے اپنی ذہنی عیاشی کے لیے مختصر سے کچھ دریچے کھلے چھوڑ رکھے ہیں۔ اس ملک میں شاہراہوں اور باغوں میں آرٹ کے نمونے نہیں، مزائل، توپیں، بمبار طیارے، ٹینک اور بحری جنگی جہاز ملیں گے، جو آپ کے ذوقِ جمال کو خوں ریز کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس ملک کی بیوروکریسی نے پوری کوشش کی ہے کہ عوام کی جمالیاتی حِسوں کو تباہ کر کے انھیں وحشی ہجوم میں بدل دیا جائے۔ ظاہر ہے اس ملک میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا روحانی سرچشمہ بہر حال مذہب ہی ہے۔ چنانچہ ہمیں اس پر تحقیق کرنی ہوگی کہ ہمارے ثقافتی بانجھ پن اور بدذوقی میں عقیدے کا کیا رول رہا ہے۔

معاشی پسماندگی:

اس میں کوئی شک نہیں، اگر ہم اقتصادی طور پر ترقی یافتہ ہو جائیں تو ثقافتی پسماندگی کا مسئلہ خود بخود حل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ تمام دیگر حقیقتوں کے باوجود معاشی پس ماندگی ہماری ثقافتی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ معاشی ترقی ہوگی تو ہمارا دنیا اور زندگی کے بارے میں وژن وسیع ہوگا۔ ہمارا زندگی سے پیار بڑھے گا، اور زندگی سے پیار بڑھے گا تب ہمیں خوشیاں اچھی لگنے لگیں گی۔ پھر ہم خوبصورتیوں کی تلاش بھی کریں گے۔ روٹی اور بقا کے چکر میں مصروف لوگ حسن و عشق کے موضوع نہیں سمجھ سکتے۔ غربت کے لیے بہاریں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ غربت جہالت کی ماں ہے، اور جہالت اندھیرے کو کہتے ہیں۔ جمالیات کا تعلق روشنیوں سے ہے، رنگوں سے ہے۔ ہمیں اپنے ملک کی معاشی ترقی کے لیے ہر دم کوشش کرنی ہوگی۔ اسی میں ہماری نجات ہے۔ ہمیں اس ملک کے بے رحم مقتدر ایلیٹ کلاس کے ہاتھ کو روکنا ہوگا جس نے ملک کے وسائل پر قبضہ کر رکھا ہے اور جسے وہ عوام کی بہبود پر خرچ کرنے کی بجائے علاقائی تناؤ کو قائم رکھنے پر ضائع کرتی ہے۔ اس کے لیے فیوڈل اور قبائلی نظام کا فوری خاتمہ ضروری ہے تا کہ ہم مکمل خواندگی اور صنعتی ترقی کی طرف گامزن ہو سکیں۔

پدرسری نظام:

پدرسری نظام عرفِ عام میں اس سماج کو کہتے ہیں جہاں مردوں کا غلبہ ہو۔ ہماری ثقافتی پس ماندگی کی ایک بڑی وجہ یہ پدرسری نظام بھی ہے۔ یہ نظام مردانہ آمریت کو فروغ دیتا ہے اور عورت کی حیثیت کو انسان سے کم تر کر کے اسے ملکیتی چیز میں بدل دیتا ہے اور جنسی آزادی پر ناروا پابندیاں لگاتا ہے، جس سے معاشرے میں گھٹن کی فضا پیدا ہوتی ہے اور معاشرے کی روحانی اور ذہنی ترقی رک جاتی ہے۔ بدقسمتی سے پدرسری نظام کی ہمارے ملک میں جڑیں ابھی تک بہت مضبوط ہیں۔ پدرسری نظام جدیدیت اور جمہوری طرزِ عمل کا دشمن ہوتا ہے۔

ماضی سے وابستگی:

جس کی ترقی رکی ہوتی ہے وہ قوم ماضی پرست ہوتی ہے۔ مسلمان مجموعی طور پر اور ہم پاکستانی خصوصاً بے حد ماضی پرست لوگ ہیں۔ ہم آج میں نہیں دور ماضی کے سہانے سپنوں میں زندہ رہتے ہیں۔ ہمیں ماضی کی ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ ہم نے تصوروں میں بٹھا رکھا ہے کہ ہم لوگ بہت اعلیٰ کیریکٹر کے ہوا کرتے تھے، ساری دنیا ہمارے سامنے سر جھکائے ہوئے تھی، وغیرہ۔ لیکن ہم سائنس، ترقی اور خوشحالی میں دنیا سے کتنے پیچھے رہ گئے ہیں، اس کے تدارک کے لیے کوئی عزم نہیں۔ ہم لوگ ماضی کی اشیا، ماضی کے حکمران، ماضی کے رسم ورواج اور ماضی کی اقدار کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ہر سوال کا جواب اور ہر مسئلے کا حل ماضی میں ڈھونڈتے ہیں۔ نہ ہم اپنے آج کو بدلتے ہیں، نہ مستقبل کی بہتری کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم آگے کو نہیں، پیچھے کو دیکھنے والی قوم ہیں۔ اسی لیے دھکے ہمارا مقدر ہیں۔ کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔ لیکن ماضی سے باہر آنے کا نام نہیں لیتے۔ ماضی پرستی اور ماضی زدگی ایک مرض کی صورت میں ہم پہ مسلط ہو چکی ہیں۔

تہذیبِ نو کے مفروضہ نقائص:

پسماندہ قوموں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ نئی تہذیب کی اچھائیوں کو کم اور اس کی برائیوں کو زیادہ دیکھتی ہیں۔ لوگ ان برائیوں کو بنیاد بنا کر اپنی کہنہ اقدار کی خیالی خوبیوں پر اتراتے رہتے ہیں اور انھی کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ جدید زمانے کے تقاضوں پر صرف نئی اقدار ہی پورا اتر سکتی ہیں۔ اور جہاں تک نئی تہذیب کے نقصانات، تضادات اور مسائل کا تعلق ہے، ان کے حل کے لیے مغرب کی اقوام بھی ہر وقت کوشاں ہیں۔ اور پھر ضروری نہیں ہے کہ ہم اندھی تقلید کریں۔ ہمیں عقلی اور سائنسی بنیادوں پر ان مسائل کا تجزیہ کرنا چاہیے، اور یوں ہم خود کو ان منفی اثرات سے محفوظ کر سکتے ہیں۔ لیکن پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ آج کے سائنسی، صنعتی، جمہوری اور سیکولر دور کے لیے صرف نئے اصول، نئے ضابطے اور نیا اندازِ فکر ہی کام آ سکتا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے قاعدے اب ہمارا کچھ نہیں سنوار سکتے۔ ہمیں نئی تہذیب کو اپنا کر اس کے تضادات کے حل کی کوشش کرنی ہوگی۔ اس سے دامن چھڑا کر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔

سیاسی نظام کے تقاضے:

پاکستان کے تناظر میں یہ سب سے اہم نکتہ ہے۔ ہمارے ملک کی سماجی اور ثقافتی پسماندگی میں مروجہ سیاسی نظام کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ہم ایک ایسی تاریخی بدقسمت صورت حال میں پھنس چکے ہیں جس سے ہمیں نکلنے کا کوئی رستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس ملک پر قابض ایلیٹ کلاس محض اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کی خاطر اس ملک کو ترقی کی طرف لے جانے والے فکری نظام سے دور رکھے ہوئے ہے، اور اس کے مفادات کا براہ راست تقاضا بن چکا ہے کہ قوم کو جاہل رکھا جائے۔ وہ صرف اس لیے عیش کر رہے ہیں کہ قوم جاہل ہے۔ چنانچہ ایلیٹ کلاس، جو سول اور ملٹری بیوروکریسی پر مشتمل ہے اور اس کے ڈانڈے اس ملک کے فیوڈل کلاس سے جڑے ہیں، وہ خود اپنی جگہ پر جدید طرزِ زندگی کے سارے لوازمات سے لطف اندوز ہوتے ہیں، لیکن میڈیا، تعلیمی نصاب اور قومی پالیسیوں کے ذریعے ان کی بھرپور کوشش ہے کہ عوام قدیم، رجعت پسند اور متروک نظریات کے شکنجے سے ہرگز آزاد نہ ہونے پائیں، انھیں خبر نہ ہو کہ آج کا انسان کہاں سے کہاں جا چکا ہے۔ ہماری ایلیٹ کلاس نے مذہب کے نام کو استعمال کر کے ہمیں ایک نہایت تنگ اور متعصب قوم پرستی کے جذبات میں پھانس رکھا ہے۔ عوام بے چارے جاہل، غریب اور کمزور ہیں۔ وہ اس طاقت اور ایلیٹ کلاس کی چالوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں، مقابلہ کرنا تو بڑی دور کی بات ہے۔ نیم خواندہ نچلا درمیانہ طبقہ گھٹن اور دباؤ کی وجہ سے راہِ نجات کے لیے مزید مذہبی طور پر شدت پسند ہوتا جا رہا ہے، جس سے نہ صرف ترقی کے امکانات اور کم ہوتے جا رہے ہیں بلکہ خطرہ بڑھتا جا رہا ہے کہ رہا سہا سول اور تہذیبی ڈھانچہ مذہبی جنونیوں کے ہاتھ لگ کر ہم پتھر کے زمانے میں نہ چلے جائیں۔

ثقافتی گھٹن کے اثرات اور مظاہر

ثقافتی گھٹن ہماری ذہنی کشادگی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ذہنی کشادگی نہیں ہوگی تو ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس طرح غیر عقلی رویوں کو فروغ ملتا ہے اور عوام کی سوچ ایک محدود دائرے میں بند ہو کر رہ جاتی ہے۔ ماضی کی اقدار اب نہ فنکشنل ہو سکتی ہیں اور نہ ان سے مثبت نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ مردہ چیزیں واپس نہیں آیا کرتیں۔ جہاں جس کسی نے مذہب کا انتہا پسندانہ نظام قائم کرنے کی کوشش کی ہے، اسے منفی نتائج اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ حالیہ تاریخ میں ہمارے سامنے ایران نے یہ تجربہ کیا اور اسے آخر کار لبرل اِزم کی طرف واپس آنا پڑا۔ اسی طرح افغانستان کی مثال سامنے ہے۔ وہاں بنیاد پرست جو کچھ کرتے رہے اسے وحشت اور بربریت کے سوا کچھ اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بات طے ہے کہ ہزاروں سال پرانے قاعدے قانون بستیوں کو کھنڈرات میں بدل کر ہی نافذ ہو سکتے ہیں۔

انسانی زندگی سے ترقی، مسرت اور خوشحالی کے عوامل نکال دیے جائیں تو اس کی زندگی جانوروں سے بدتر ہو جاتی ہے۔ جانور پھر بھی فطری تقاضوں کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ مذہبی انتہا پسند انسان کو نہ صرف غیر مہذب ہونے پر مجبور کرتا ہے بلکہ خود ساختہ اور تنگ نظر اخلاقی نظام رائج کر کے جبلّی خوشیوں کو بھی برباد کر دیتا ہے۔ اَب ہم مختصراً ثقافتی گھٹن کے ان مظاہر پر بات کریں گے جو ہماری سوسائٹی میں عام ہیں:

کھل کر بات نہ کر سکنا:

اس طرح کی سوسائٹی میں انسان بچپن سے ہی والدین، عزیز و اقارب، مولوی اور اساتذہ کے ''یہ نہ کرو، وہ نہ کرو'' کے ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ جھوٹ سچ، اچھے بُرے، گناہ ثواب اور پاک ناپاک کے ایسے جامد معیار دیے جاتے ہیں جن میں کس طرح کی ترمیم کا کوئی سوال نہیں ہوتا، اور ان پر مزید غور فکر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ سوسائٹی انسان کی اظہار کی جبلّت کو دبا دیتی ہے۔ ایک ایسا کلچر پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر شخص جو سوچتا ہے، جو محسوس کرتا ہے اور جو چاہتا ہے، اسے دوسروں کے سامنے کھل کر بیان نہیں کرتا۔ اور جو اظہار کرتا ہے اسے بدل کر اور ماحول سے مطابقت پیدا کر کے پیش کرتا ہے، یا پھر اپنے خیالات کو اپنے اندر ہی محفوظ رکھتا ہے۔ اس طرح سوسائٹی میں جھوٹ اور منافقت کا ماحول چلتا رہتا ہے۔ یہاں انسانی اظہار پر ''دنیا کیا کہے گی'' کا ایک مضبوط سنسر عائد ہوتا ہے۔ کھل کر بات نہ کر سکنے سے افراد کے اندر فکری اور تخلیقی صلاحیتیں بھی دب جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نسل در نسل، بغیر کسی سماجی ارتقا کے، اندھوں کی قطار کی طرح چلتے ہیں۔

خوشی کا اظہار نہ کر سکنا:

ثقافتی پسماندگی کا ایک اور مظہر انسان کو خوشی کے اظہار سے روکنا ہے۔ تمام تر سائنسی و مادی حقائق اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ انسان طبعی قوتوں کی تخلیق کردہ مخلوق ہے۔ خوشی زندگی کا اظہار ہے۔ خوشیاں ہی انسان کو زندگی کی قدر کرنے اور اس سے محبت کرنے کی طرف مائل کر سکتی ہیں۔ ظاہر ہے اگر زندگی میں خوشی نہیں ہے یا خوش ہونے کی اجازت نہیں ہے تو زندگی کے ساتھ دلچسپی بھی واجبی رہ جائے گی۔ خوشی تجریدی عمل نہیں ہے۔ فطرت نے اس کے جسمانی اظہار مقرر کر رکھے ہیں۔ انسان خوشی سے تالی بجاتا ہے، ناچتا ہے، گاتا ہے، جھومتا ہے، کسی اپنے کو چومتا ہے، گلے لگاتا ہے، ترنگ اور مستی میں آنا چاہتا ہے۔ یہ وہ سب اظہار ہیں جن سے انسان زندگی کی خوبصورتی کو خراج پیش کرتا

ہے۔لیکن اخلاقیات اور ایمان کے نام نہاد محافظ خوشی کے اظہار سے الرجک ہیں، اس لیے کہ انھیں زندگی سے دشمنی ہے۔ان کی ساری دلچسپی بعدازموت کی خیالی زندگی سے ہے۔جو حقیقت سامنے ہے اس سے انکار ہے، جو سامنے نہیں ہے اسے حقیقت مانا جاتا ہے۔لیکن ایک بات طے ہے— جو قومیں خوشی کا اظہار نہیں کرسکتیں، خوشیاں ان کی زندگیوں میں آتی بھی نہیں ہیں۔زندگی کو بھی ان لوگوں سے کوئی پیار نہیں ہوتا۔ ان کا شمار مُردہ اور غلام قوموں میں ہوتا ہے۔ہمیں اپنے انسان ہونے کا اعلان کرنا ہوگا۔خوشی ہمارا حق ہے۔زندگی خوبصورتی کا نام ہے۔ اسے ہم نے اور خوبصورت بنانا ہے۔

فطری تقاضے پورے نہ کرسکنا:

انسان پہلے حیوان ہے بعد میں انسان۔وہ گوشت پوست اور خون کا بنا ہے۔یہ محض ایک ترقی یافتہ حیوان ہے جس میں ذہانت، تخلیقی جوہر اور جمالیاتی حس در آئی ہے، ورنہ نچلی سطح پر، جسمانی اور جبلتی لحاظ سے، اس کے بھی وہی تقاضے ہیں جو حیوانوں کے ہوتے ہیں۔اور اس پر ہمیں شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔نہ ہی یہ تقاضے گندے، پلید اور گناہ ہیں۔زندگی کی ساری اُٹھان انھی سے ہے۔اگر یہ نہ ہوتے تو دیگر انسانی پہلوؤں کا بھی کوئی وجود نہ ہوتا۔لیکن خودساختہ تہذیب اور ثقافت نے ان فطری تقاضوں کی تسکین کی راہ میں ایسی پابندیاں لگا رکھی ہیں کہ انسان کو حیوان سے بدتر اور محروم کردیا ہے۔یاد رکھیے کہ یورپ نے فطری تقاضوں کی راہ سے جو پابندیاں اٹھائی ہیں، ان کی مادی ترقی کا اس سے گہرا تعلق ہے۔فطری تقاضوں کو دبائے رکھنے والی قوم ذہنی مریض ہوتی ہے، اور ذہنی مریض معاشی اور سائنسی ترقی میں کمال حاصل نہیں کرسکتے۔مکمل انسان بننے کے لیے سوسائٹی کو کھلا رکھنا اور انسان کو اس بات کی آزادی دینا بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے فطری تقاضے اپنی مرضی اور خوشی کے مطابق پورا کرسکے۔تبھی وہ ذہنی اور جسمانی تناؤ سے آزاد ہوکر تخلیقی کام کرسکے گا۔سوسائٹی کے اندر ڈسپلن قائم کرنا اور چیز ہے، جسمانی مطالبوں کی فطری تسکین نہ ہونے دینا اور بات ہے۔فطری تقاضوں کے ساتھ گناہ، عریانی اور بے حیائی کا تصور، سب غیر سائنسی باتیں ہیں اور انسان پر بہت بڑا ظلم ہیں۔

حسن کی تلاش نہ کرسکنا:

پس ماندہ معاشرے حسن کے دشمن ہوتے ہیں۔یہاں خوبصورتی جُرم ہے۔گلیمر سے انھیں تکلیف ہوتی ہے۔حسن کی تلاش اور اس کا اظہار سب بُری باتیں ہیں۔یہاں ہر خوبصورت جذبے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔حسن ایک وسیع المفہوم لفظ ہے۔اس پر زیرِ نظر کتاب میں الگ سے مضمون موجود ہے۔یہاں پر ہم مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ثقافتی لحاظ سے پس ماندہ قومیں غلاظت پسند ہوتی ہیں۔نہ ان کا اندر خوبصورت ہوتا ہے نہ باہر۔انکساری، پاکدامنی، خاکساری، اعتدال اور حیا کے نام پر اپنے کو بدصورت کرنا ان کا شیوہ ہوتا ہے۔حسن کی جستجو ہی انسان کو تخلیق پر مجبور کرتی ہے، جو کسی ایک حالت پر مطمئن نہیں ہونے دیتی، بلند سے بلند تر خوبصورتی کا تقاضا کرتی ہے۔جب کہ پس ماندہ قومیں صدیوں سے ایک ہی حالت میں پڑی رہتی ہیں اور انھیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ زمانہ کہاں جاچکا ہے۔یہ لوگ مسائل کا حل مزید تاریکی میں تلاش کرتے ہیں۔انھیں پہلے سے زیادہ گندگی کی طرف جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ان کا فلسفۂ حیات انھیں زندگی سے دشمنی سکھلاتا ہے۔ انھیں بتایا جاتا ہے کہ یہ زندگی عارضی ہے، امتحان ہے، کسی اولین گناہ کی سزا ہے۔اصل زندگی موت کے بعد ہے جو تمام ریڈی میڈ عیاشیوں اور آسائشات سے پُر ہے۔لہٰذا ہر وہ چیز جو زندگی کی طرف لے جائے اور زندگی کو اور خوبصورت کردے وہ انھیں بُری لگتی ہے۔

سائنسی روّیہ نہ اپنا سکنا:

یہ دنیا مادی دنیا ہے جو طبعی اصولوں، قاعدوں اور قوانین کے مطابق چل رہی ہے، اور تمام مظاہر کی تخلیق انھی کے باہمی عمل واشتراک کا نتیجہ ہے

جن کو صرف عقل اور تجربے سے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔لیکن ثقافتی پسماندگی ہمیں عقل دشمن بناتی ہے، یہاں عقل کا استعمال جُرم ہوتا ہے۔اس سوسائٹی کا سنہرا اصول یہ ہوتا ہے کہ سنی سنائی باتوں پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لیتے آیئے، اور پھر انھیں دنیا کی آخری حقیقت قرار دے کر دہراتے جایئے۔کسی کو جرأت نہ ہونے دیجیے کہ وہ ان کی تردید کرسکے، اور جو ایسا کرے، اسے مذہب کا باغی اور وطن دشمن قرار دے کر ٹھکانے لگا دیجیے۔چنانچہ پس ماندگی ہمارا مقدر بن گئی ہے، ہم ترقی یافتہ قوموں سے بہت دور رہ گئے ہیں۔جن لوگوں نے سائنسی رویے اپنا کر زندگی کے تمام فیصلے کیے ہیں، زندگی کی راہیں ان کے لیے قابلِ رشک ہوگئی ہیں۔اور ہم لوگ، جو عقل سے عاری اور ایمان سے لبریز ہیں محتاجی اور ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔کوئی فرد اپنے نجی فیصلے عقل اور سائنسی روّیے سے کرتا نظر نہیں آتا، چنانچہ اس کے مسائل پہلے سے دو چند ہوتے چلے جاتے ہیں، اور یہی حال ساری سوسائٹی، قوم اور ملک کا ہے۔سب جذبات اور حماقت سے فیصلے کرتے نظر آئیں گے۔نجات ان کا مقدر کیوں کر ہوسکتی ہے؟

نئے نظریات نہ اپنا سکنا:

ثقافتی پسماندگی لوگوں کو ضدی اور جذباتی بنانے میں مدد کرتی ہے۔یہ نئے نظریات کو اپنانے سے ہچکچاتے ہیں۔سارا معاشرہ قدیم، متروک اور کہنہ خیالات کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جس سے نئے خیالات کو اپنانے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔وقت اور حالات کے نئے تقاضے ہوتے ہیں، لیکن یہ ان کا ساتھ نہیں دے پاتے۔چنانچہ ان کے سب فیصلوں کے نتائج ان کی اپنی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔لیکن یہ نہ سیکھتے ہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔آگے دیکھنے اور آگے جانے کی بجائے اور پیچھے کو جائیں گے۔متروک کو مقدس اور نئی کو بدعت سمجھتے ہیں، لہٰذا وقت انھیں پیچھے پھینکتا چلا جاتا ہے۔

تہواروں کا نہ ہونا:

ثقافتی پابندیوں اور سخت اخلاقی کنٹرول ہونے کی وجہ سے قوم کی سماجی زندگی بوریت اور یکسانیت کا شکار ہوجاتی ہے۔انسانی تہذیب کا خاصہ رہا ہے کہ عوامی سطح پر لوگ سال میں کچھ دن کسی نہ کسی بہانے خوشیوں کے میلے لگاتے ہیں، مل کر ناچتے ہیں، گاتے ہیں، کھیلتے ہیں، بھیس بدلتے ہیں، تاکہ سارے سال کی محنت مشقت اور ذہنی تناؤ کے بعد ایک یا چند دن ایسے گزارے جائیں جو صرف اپنی خوشی، مستی اور تفریح کے لیے ہوں۔یہ وہ دن ہوتے ہیں جب قومیں روٹین کے سماجی ضوابط نرم کردیتی ہیں۔لیکن ہمارا حال اس سے برعکس ہے۔ہمارے ہاں کسی کارنیوال (carnival) کا کوئی تصور نہیں۔سخت سماجی کوڈ کی وجہ سے خوشی کے نام نہاد تہوار عام دنوں سے زیادہ بوریت کا سبب ہوتے ہیں۔مجبور کیا جاتا ہے کہ خوشی غیر متحرک اور مجہول بن کر منائی جائے۔مسرت وانبساط کا بے ساختہ (spontaneous) اور فزیکل اظہار ممنوع ہے۔تہواروں پر بھی انھی ضابطوں کے اندر رکھا جاتا ہے جن میں سال بھر رہے ہوتے ہیں۔خوشیوں پر پابندیوں کی وجہ سے یہ قوم ذہنی مریض بن جاتی ہے۔ایسی قوموں میں بنیاد پرستی اور جہادی تحریکیں فروغ پاتی ہیں جو امن کی دشمن ہوتی ہیں اور جن کے لیے اس دنیا کو تہہِ تیغ کرکے مالِ غنیمت سمیٹنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

فنونِ لطیفہ کا محدود رہ جانا:

ثقافتی پابندیاں وہی قوم لگاتی ہے جس کی حسِ لطافت مرچکی ہوتی ہے اور جس کی نگاہ میں حسن کی بجائے خون اترا ہوتا ہے۔ہم موت پسند قوم ہیں۔اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارے شہروں کی گزرگاہوں کو مزائلوں، توپوں اور ٹینکوں کے نمونوں سے نہ سجایا جاتا۔ہمیں تباہی کی ان علامتوں سے اس قدر محبت نہ ہوتی۔یورپی شہروں کی طرح ہمارے شہر بھی خوبصورت مجسموں اور عمارتیں مصوری کے شاہکار نمونوں سے مزین ہوتیں۔

ہمارے ہاں فنونِ لطیفہ کو یا تو بُت پرستی کا نام دے کر مٹایا گیا یا پھر اسے فحاشی اور لہو ولعب قرار دیا گیا۔ حالانکہ فنونِ لطیفہ کے بغیر انسان انسان نہیں۔ انسان ماحول کو حسین تر کرنے والی مخلوق ہے۔ جتنا ماحول حسین ہوتا ہے انسان کی اندرونی نظر اسے اور زیادہ خوبصورت بنانے کے خواب دیکھتی اور تصور بناتی ہے۔ فنونِ لطیفہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ انسان محض گوشت پوست کا پُتلا نہیں، وہ مادے کی نہایت اعلیٰ تخلیقی اور لطیف ترین خصوصیات کا حامل ہے۔ رقص، موسیقی، شعروادب، مصوری، مجسمہ سازی اور فلم سازی سب رُو بہ زوال اور سخت کوڈ کے اندر جاں بلب ہیں۔ ہمارے ہاں جہالت اور تاریکی کو کھلی چھوٹ ہے۔ اس پر کوئی سنسر نہیں۔ معاشرے کو بدنما اور تباہ کرنا کوئی مسئلہ نہیں۔ ہم وہ قوم ہیں جسے جنگ سے کوئی نفرت نہیں۔ دشمن کو مٹانے کے لیے جنگ کی خواہش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی اور اس کی خوبصورتیوں سے ہماری محبت مٹ چکی ہے۔

حسن، عشق اور پسماندہ اقوام

حسن اور عشق کے دو الفاظ جغرافیائی اور زمانی حدود سے ماورا اس طرح انسانی تہذیب سے وابستہ چلے آ رہے ہیں کہ نہ انسان کی نظر کو مائل بہ حسن ہونے سے روکا جا سکا ہے، اور نہ ہی اس کے دل کو عشق کے جذبوں سے عاری کیا جا سکا ہے۔ گویا حسن پرستی اور عشق کے جذبات انسان کے اندر فطری طور پر پائے جاتے ہیں۔ انسان کی تمام سرگرمیاں دراصل حسن و عشق کے ستونوں پر ہی تعمیر ہوتی ہیں۔ انسان اپنی سرگرمیوں کو صرف ذاتی تحفظ تک محدود نہیں رکھتا۔ وہ بنیادی ضرورتوں سے آزاد ہو کر بھی اپنی پیداواری سرگرمیاں جاری رکھتا ہے اور اشیا کو حسن کے قوانین کے مطابق بناتا ہے۔

ذرا غور کریں تو ایسا لگتا ہے جیسے حسینۂ فطرت نے انسان کے رُوپ میں اپنا ایک عاشق پیدا کیا تھا، جو روزِ اوّل سے ہی اپنے محبوب کو زیادہ سے زیادہ پانے کے لیے سرگرداں ہو گیا۔ بقول غالب:

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

لہٰذا انسان جو چیز تخلیق کرتا ہے اسے حسن کے اس معیار پر پہنچانا چاہتا ہے جس میں اس کے محبوب کا عکس دکھائی دے سکے، لیکن کچھ دیر بعد وہ اس کے معیار سے غیر مطمئن ہو جاتا ہے اور اسے پھر سے تبدیل کر کے مزید خوبصورت اور بہتر بناتا ہے۔ یوں ارتقا و ترقی کا عمل انسانی تہذیب میں جاری و ساری ہے۔ چنانچہ کوئی قوم فطرت کی نیرنگیوں اور حسن کاری کی گہرائی میں جتنا ڈوبتی ہے، اتنی ہی حسینۂ فطرت اس پر اپنے التفات کی بارش کر کے ان کی زندگیوں میں خوبصورتیاں اور سرفرازیاں بھر دیتی ہے۔

خدا، کائنات اور انسان کے باہمی رشتے ہمیشہ سے انسانی فکر کا مرکزی موضوع رہے ہیں۔ جب یورپ میں سائنس کو فروغ ہوا اور حجاباتِ عالم سے پردے اُٹھنے لگے، سائنس نے تو یہ کہہ کر اس بحث کو ختم کر دیا کہ کائنات اور انسان دونوں ایک ہی مادے کی پیداوار اور مختلف شکلیں ہیں اور مادے کی حرکت تغیر کے قوانین کے تابع ہے جو معروضی طور پر کسی مافوق الفطرت قوت کی دخل اندازی کے بغیر چل رہی ہے۔ لیکن ہم جیسی پسماندہ اقوام کی ذہنی سطح کے لیے سائنس کا یہ موقف نا قابلِ فہم ثابت ہوا۔ حالانکہ ہمارے ہاں صوفیانہ فکر کی ایک شاندار روایت موجود تھی، جو ہمیں اس مخمصے سے باہر نکالنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ صوفیائے کرام نے خالق اور مخلوق کی ثنویت (separation of universe and creator) کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، کیونکہ روایتی مذہب کا تصور صرف کائنات کی اکائی کے تصور کو ہی ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرتا بلکہ خدا کے لامحدود (infinite) ہونے کے تصور کو زک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ صوفیا وحدت الوجودی عقیدے پر قائم رہے۔ وہ کہتے تھے ہر شے اور بندے میں خدا کا جلوہ موجود ہے۔ ہماری مذہبی روایت — ''نہیں کچھ موجود سوائے اُس کے'' — اور سائنس کے موقف میں اتنا فرق نہیں ہے جتنا مُلّا کو نظر آتا ہے۔ سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ ''نہیں کچھ موجود سوائے اِس کے''۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو موجود ہے وہ وہی تو ہے — سائنس نے بھی وحدت کی بات کی ہے۔ سائنس اور صوفی ازم کے اختلاط (synthesis) سے ایک طرف ہماری مادی ترقی اور تسخیرِ کائنات کے عمل کے بارے میں ہماری فکری اُلجھنیں بھی دور ہو سکتی تھیں اور ہمارے اندر روحانی خلا بھی نہ پیدا ہوتا۔

چنانچہ مادہ اور مادیت میں کوئی بُرائی نہیں۔ اگر مادہ گالی ہوتا تو ''قدرت'' اپنا سارے کا سارا اظہار صرف مادے کی صورت اور اس کے اندر ہی کیوں کرتی۔ مادی کائنات میں اُتر کر ہی قوانینِ فطرت آشکار ہوتے ہیں، تسخیرِ کائنات کا عمل شروع ہوتا ہے، گویا انسان اپنے کُل سے قریب ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں دنیا و آخرت یعنی آج اور کل کی سرفرازیاں عطا ہوتی ہیں جو ترقی یافتہ قوموں کو میسر ہیں۔ اُن کے ماحول،

بود و باش، طرز اور معیارِ زندگی کو دیکھیں، چار سُو خوبصورتی اپنے آپ کو پھیلائے ہوئے نظر آتی ہے۔ وہ جو چیز بناتے ہیں، اسے اوجِ کمال اور حسن کی معراج پر لے جاتے ہیں۔ ہماری اشیا بھدی اور بھونڈی کیوں ہوتی ہیں؟ اس لیے کہ ذوقِ جمال سے عاری نظریں اور عشق یعنی commitment سے خالی دل کام کر رہے ہوتے ہیں۔ کہنے کو تو ہم خدا کو حسن سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسے میں چاہیے تو یہ تھا کہ ہمارے ہاں وہ فلسفۂ زندگی رائج ہوتا کہ ہم جتنے زیادہ حسین بنیں گے یا جتنا زیادہ ماحول کو خوبصورت بنائیں گے، اتنے ہی اپنے اندر الہامی وجدان محسوس کریں گے۔ لیکن عجیب المیہ ہے کہ کوئی قوم پسماندگی، غربت، جہالت اور گندگی میں جتنی آگے ہوتی ہے، وہ اتنا ہی ''خدا'' کے قریب ہونے کی دعویدار ہوتی ہے! ہمارے ہاں ان لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی صورت اور حلیے کو بدوضع کر کے خود کو اللہ کے نمائندہ سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

احساسِ حسن اور ذوقِ جمال بھی زندگی کی جدوجہد کے تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ انسان کے ذوقِ جمال کے سر چشموں کا پتا لگانے کے لیے سماجی علوم کی مدد لینا ضروری ہے۔ جمالیاتی ذوق کو کُلی طور پر وجدانی، داخلی اور انفرادی نہیں سمجھا جا سکتا۔ چنانچہ معاشی طور پر پسماندہ رہ جانے والی اقوام احساسِ حسن اور ذوقِ جمال کے ارتقا میں ہی پیچھے نہیں رہ جاتیں بلکہ عشق کے جذبے یا تو معدوم ہو جاتے ہیں یا قابلِ تعزیر قرار پاتے ہیں۔ اور وہ معاشرہ

جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

کی زندہ تصویر بن جاتا ہے۔ کوئی معاشرہ کتنا ترقی یافتہ ہے، اس کو یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ اس معاشرے کے رگ و پے میں حسن پرستی کس حد تک سرایت کر چکی ہے اور وہ معاشرہ لگن (commitment) کو کن نظروں سے دیکھتا ہے۔ عشق وفا سکھاتا ہے، پیمان باندھتا ہے اور ہر حالت میں کسی کا ہو جانا سکھاتا ہے۔ عشق کے اندر ایک ایسا لاثانی جذبہ ہے جس نے انسانی تہذیب کو نفرتوں میں ڈوب جانے سے روکے رکھا ہے۔ عشق انسان کو ایک کرتا ہے، تمام علاقائی، مذہبی، رنگ، نسل اور طبقاتی تفریقوں کو مٹاتا ہے۔ یہ وہ کام ہے جو بڑے بڑے فلسفے، ادیان اور ازم نہ کر سکے۔

ہمارے سماج میں ذرا نظر دوڑا کر دیکھیں، کسی مقصد کے ساتھ دیانت داری سے کمٹڈ (committed) ہونا مالیخولیا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عشق دیانت دار ہونا سکھاتا ہے۔ کوئی معاشرہ جب عشق سے عاری ہوتا ہے تو بِک جانا، اپنی بات سے پھر جانا اور بددیانت ہونا وہاں کے لوگوں کے مزاج میں شامل ہو جاتا ہے۔ تیسری دنیا کے سب پسماندہ معاشرے اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ علم کی روشنی سے بے بہرہ اور غیر ترقی یافتہ معاشرہ ذہنی، ثقافتی اور روحانی لحاظ سے بھی اتنا ہی پسماندہ ہوتا ہے جتنا مادی لحاظ سے۔ اس کے اندر حسِ لطیف ہی ختم نہیں ہوتی، حسن دشمنی بھی اس کا کلچر بن جاتی ہے۔ چنانچہ اس معاشرے میں ہر خوبصورت چیز کی مخالفت کی جاتی ہے اور فنونِ لطیفہ کی تمام اقسام سے معاندانہ رویہ فروغ پانے لگتا ہے۔ اس معاشرے میں رنگوں کی زبان مصوری، اعضا کی شاعری رقص، خلاقیت کی عکاس مجسمہ سازی، کانوں میں رس گھولنے والی نغمگی اور فنِ اداکاری سبھی لہو و لہب اور حرام قرار پاتے ہیں۔ لیکن اِن پاک باز معاشروں میں کسی زور آور کا کسی مظلوم عورت کو بے لباس گلیوں میں پھرانا، ریاستی کنٹرول کے بندی خانوں میں مجبوروں کی عزتوں کا لُٹ جانا، عصمتوں کے بازاروں کا سجے ہونا، بالائی طبقوں کو ''مال'' فراہم کرنے کے ایکسچینج کھلے ہونا، کسی شہری کی جان و مال کا محفوظ نہ ہونا معمولات میں شامل ہوتے ہیں! اور حکمران ہر وقت اس فکر میں غلطاں رہتے ہیں کہ کہیں عوام کی اخلاقیات ٹی وی کی فنکاروں کو دیکھ کر خراب تو نہیں ہو رہی۔

پسماندہ معاشرے محدود سوچ اور سطحی فکر کے معاشرے ہوتے ہیں جہاں ہر لفظ محدود ہو کر اپنے معنی کھو دیتا ہے۔ ایسے معاشرے میں اخلاقیات اور شرافت کی نگہبانی کا دعویٰ کیا جاتا ہے جہاں پر اصول پرستی اور اخلاقیات دم توڑ چکی ہوتی ہیں۔ ٹی وی پروگراموں میں نسوانی کرداروں کو چادروں میں لپیٹ کر انھیں بوڑھی اماؤں کے مشابہ بنا دینا دراصل اخلاقیات کا تحفظ نہیں بلکہ حسن اور شباب سے دشمنی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عوام کے اندر جمالیاتی حِسیں پیدا ہو جائیں اور وہ خوب صورت اور گلیمر بھری زندگی کا مطالبہ کرنے لگیں۔ کہیں وہ سوال نہ اُٹھانے

لگیں کہ ہمارے لباس بوسیدہ کیوں ہیں، ہماری بستیاں غلاظت زدہ کیوں ہیں، ہمارا ماحول جہالت سے گھرا ہوا کیوں ہے؟

چونکہ زمانۂ شباب فطری طور پر حسن سے منسلک ہے اور جدید زمانے کا نمائندہ بھی، لہٰذا تاریک قوتیں سب سے پہلے نوجوانوں سے خوفزدہ ہوتی ہیں، چنانچہ نوجوانوں کو مختلف النوع مقدس نعروں کے فریب دے کر بنیاد پرست اور فرقہ پرست تنظیموں میں پھانس لیا جاتا ہے تاکہ معاشرے میں فطرت نوجوانوں کی شکل میں تبدیلی کے جو بیج پیدا کرتی ہے انھیں ٹھکانے لگا دیا جائے، اور یہی نوجوانوں زندگی کی راہوں میں تھوڑا سا آگے جا کر بوڑھی قدروں کے محافظ بن جائیں۔ تاریک قوتوں کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ معاشرہ جہالت کی تاریکی سے نہ نکلنے پائے۔ معاشرے میں صنفی بنیاد پر علیحدگی (segregation) کی ترویج کر کے نفاست اور تہذیب کو پنپنے سے روک دیا جاتا ہے۔ معاشرے میں عورت اور مرد کو سماجی لحاظ سے الگ الگ کرنا تہذیب کی توہین اور انسانی وقار کے خلاف ہے۔ مخلوط معاشرے زیادہ شائستہ اور متمدن ہوتے ہیں۔ مخلوط سماج کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان مہذب ہے، اس سے جنگلی رویوں کی توقع نہیں ہوسکتی۔ جب کہ مرد و زن کی علیحدگی پر ایمان رکھنے والوں کے تحت الشعور میں آج بھی جنگلی انسان بسا ہوا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جونہی مرد و زن کے درمیان سماجی روابط کی اجازت ہوئی، وہ بلا امتیاز جنسی اختلاط میں مشغول ہو جائیں گے! ایسے لوگ جو انسانوں کو جنگلی جانور سمجھتے ہوں، نفاست اور تمدن پر مبنی معاشرہ کیسے تشکیل دے سکتے ہیں؟ حیا اور شرافت کے ان ٹھیکیداروں کی ذہنی پاکیزگی اندازہ لگائیے کہ یہ انسان کو انسان نہیں، عورت کو عورت نہیں، مرد کو مرد نہیں سمجھتے بلکہ ان کو ان کے جنسی اعضا کے حوالوں سے ہی دیکھتے ہیں۔

مادی ترقی اور ثقافتی ارتقا باہمی طور پر ایک دوسرے سے جُڑے ہوتے ہیں۔ اگر ہم مادی ترقی کے خواہش مند ہیں تو نئی اقدار کا جنم لازمی تقاضا ہے۔ یہ تاریخی عمل کے خلاف ہے کہ ہم جدید صنعتی معاشرے کی خواہش بھی کریں اور فیوڈل قدیم اخلاقی روایات کو بھی لاگو رکھیں۔ سائنسی فکر وسعتوں میں نکل جانے اور گہرائیوں میں اُتر جانے کا نام ہے۔ کنوؤں کے مینڈک سمندروں کی بے کنار وسعتوں سے ہم کنار نہیں ہو سکتے۔ ہمیں بھی یورپ کی طرح رینے سانس (renaissance) اور روشن خیالی کے ادوار لانے ہوں گے جس میں مہذب اور مولوی کا سماجی کردار محدود کر کے، خیالات کی آزادانہ ترویج کو موقع دے کر، صنعتی معاشرے اور اس کے کلچر کی راہ ہموار کرنی ہوگی۔

ہم معاشرے کو طبقاتی لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں — بالائی، متوسط اور نچلا محنت کش طبقہ۔ بالائی طبقہ اپنے وسائل، دولت اور طاقت کے لحاظ سے اپنی زندگی جیسے چاہے گزارنے پر قادر ہوتا ہے۔ جس پاکیزگی اور اخلاقیات کا درس یہ طبقہ قوم کو دے رہا ہوتا ہے وہ خود اس سے مبرا زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ وہ بغیر کسی مداخلت کے زندگی کی تمام رنگینیوں اور روشنیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جہاں تک نچلے محنت کش طبقے کا تعلق ہے وہ زندگی کے خوبصورت تصوروں سے ہی محروم ہو چکا ہوتا ہے۔ مسئلہ رہ جاتا ہے درمیانے طبقے کا، جو نچلے طبقے کی بدنصیبی بھی دیکھ رہا ہوتا ہے اور بالائی طبقے کی تعیش سے بھرپور زندگی کا علم بھی رکھتا ہے۔ ایک طرف وہ نچلے طبقے میں جانے سے خوف زدہ ہوتا ہے، دوسری طرف وہ بالائی طبقے میں شامل ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کا فکری اور علمی اثاثہ اسی درمیانہ طبقے کا رہین منت ہوتا ہے۔ حسن اور عشق اسی کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ معاشرے کی مسلسل ترقی، خوشحالی اور خوبصورتی میں ہی اس کے مفادات مضمر ہوتے ہیں۔ آج ہمارا معاشرہ جمالیات دشمن تاریک قوتوں کی بلیک میلنگ میں آ چکا ہے۔ روشن خیالی، عقل دوستی، خرد افروزی اور تحقیق پسندی، مذہبی جنونیت کے سامنے دم توڑ رہی ہے۔ بے ضرر خوشیوں یا مسرتوں کی محفلوں کا انعقاد ہو، بسنت کی تقریبات ہوں یا سالِ نو کی، کوئی چیریٹی شو ہو یا پاپ میوزک میں بہن بھائی کا مل کر گانا، یا کسی گھر کی چار دیواری میں کلاسیکی رقص کا مظاہرہ، جنونی عناصر کلاشنکوف لیے آ دھمکتے ہیں۔ آج وقت کی ضرورت ہے کہ متوسط طبقے کا ذہین و فطین حصہ معاشرے کو رواداری، نفاست اور تہذیب سے آگاہ کرے۔ زندگی اور اس کے حسن سے محبت کرنے والے ہمیشہ بدصورتی، تاریکی، سنگدلی، پستی اور بے انصافی سے برسرِ پیکار رہے ہیں۔ خودغرضی، جنگ جوئی، ذات اور وطنیت کی بنیاد پر نفرتیں، بے حسی اور جہالت، سب زندگی کے حسن کو داغ دار کرتے ہیں۔ انسان نے درندگی چھوڑ کر انسانیت حاصل کی تھی اور اس نے انسان بننے کی جدوجہد میں سائنس اور فنونِ لطیفہ کو پیدا کیا تھا۔ لیکن تاریک قوتیں تقدیس اور روایات کے نام پر انسان کو پھر درندگی کی

طرف لے جانے کے درپے ہیں۔ہم پہلے ہی اس دنیا میں پیچھے رہ جانے کا بہت خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ہمارا اس دنیا کی تعمیر،ترقی اور رفتارِ عمل میں پہلے ہی حصہ نہ ہونے کے برابر ہے اور اس پر مستزاد ہم روشنی اندھیرے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔مسائل کے حل کے لیے آگے کی بجائے صدیوں پیچھے دیکھتے ہیں۔سوالوں کا جواب عقل سے پوچھنے کی بجائے مُردہ روایات میں ڈھونڈتے ہیں۔ظاہر ہے اس طرح ہمارا اور ہم جیسی پس ماندہ قوموں کا آج سنور سکتا ہے اور نہ مستقبل خوبصورت ہوسکتا ہے۔

آئیڈیالوجی کی اسیر سوسائٹی

پاکستان ایک نوآزاد ملک اور اس کے عوام ایک نوزائیدہ قوم ہیں۔ 1947 سے قبل اقوام عالم میں اس کی کوئی آزادانہ شناخت نہ تھی۔ یہ خطہ دنیا میں اپنی پوری تاریخ اور تہذیب وثقافت کے لحاظ سے ہندوستان کہلاتا تھا اور یہاں کے لوگ ہندوستانی۔ چنانچہ شناخت کا حصول اِس نئی قوم کا سب سے پہلا چیلنج تھا۔ ہمارے اکابرین نے اس نفسیاتی مسئلے کو جوں جوں سلجھانے کی کوشش کی یہ اور اُلجھتا گیا۔ شناخت کی تلاش اتنے بھونڈے، منفی اور غیر سائنسی طریقے سے کی گئی کہ اب وہ مقام آ گیا ہے کہ عالمی قائدین اور میڈیا ہمارے اس دل وجان سے عزیز وطن کے بارے میں ''ناکام ریاست'' کے الفاظ استعمال کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ مسئلہ فقط ریاست کا نہیں، پوری قوم تاریخ کے سامنے ناکام ٹھہرے گی کہ تاریخ کے ایک خاص مرحلے پر ایک نئی قوم اپنی نئی شناخت کے ساتھ اُبھری، لیکن وہ خود کو اس کا اہل ثابت نہ کرسکی۔ یہ نوبت تو فی الحال نہیں آئی، لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ قوم اپنے وجود کا نصف صدی سے زائد عرصہ گزارنے کا باوجود ابھی تک شناخت کے شدید بحران کا شکار ہے۔ یہ خود کو عالمی برادری کے ایک باوقار رکن کے طور منوانا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے اقدام اور پالیسی وہ اپناتے ہیں جو ان کی خواہشات کے برعکس نتائج پیدا کرے!

ملک کی بانی قیادت کوئی آئینی ڈھانچہ اور قومی پالیسی خطوط تیار کرنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ چنانچہ اس پر ایک ایسی طاقت ور اسٹیبلش منٹ مسلط ہوگئی جس نے اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے جمہوری اور سیاسی عمل سے ملکی قیادت کو پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔ عوام کو موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اپنے مسائل کا خود تجزیہ کریں اور اپنی مستقبل کی راہوں کو خود متعین کریں۔ تمام پالیسیاں بیرکوں سے وارد ہوتی ہیں اور عوام کو غداری کے فتوے سے بچنے کے لیے بے چون وچرا ان پر چلنا پڑتا ہے۔ پاکستانی ریاست کی مندرجہ ذیل شناختی خصوصیات مذکورہ اسٹیبلش منٹ نے ہمیشہ کے لیے طے کر رکھی ہیں:

(1) مذہب سے وابستگی
(2) سماجی قدامت پرستی
(3) ہندو دشمنی

یہ ہیں وہ عناصر جو بحیثیت پاکستانی ہماری شناخت کرواتے ہیں۔ ہماری جیسی نوآزاد قوم کی ترقی اور ارتقا کے امکانات کے خاتمے کے لیے اس سے زیادہ اور سنہری اصول کیا ہو سکتے تھے! ان تینوں کے ساتھ ایک شہری کی جتنی زیادہ وابستگی ہوتی ہے، وہ اتنا ہی ریاست کے قریب اور محبِّ وطن قرار پاتا ہے۔ ظاہر ہے جو لوگ ریاست کے جتنے قریب ہوں گے اتنے ہی ان کے دنیاوی مفادات بھی پورے ہوسکیں گے۔ جب زندگی کے معاملات مقدس قرار دیے جائیں تو جمہوری مکالمہ ترقی نہیں پاسکتا۔ چنانچہ اس ملک میں وہ دانشور طبقہ اُبھر کر سامنے نہ آ سکا جو عوامی مفادات اور سماجیات کے سائنسی نظریات کے بنیاد پر قومی امور پر رائے تشکیل دینے میں مددگار ہوتا۔

قائداعظم نے اسلام کا قلعہ بنانے کی نہیں، مسلمان قوم کے مفادات کے تحفظ کی سیاسی جنگ جیتی تھی۔ پاکستان بنتے ہی انھوں نے اسلامی تھیا کریسی (theocracy) کو رد کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ آج کے بعد پاکستان میں کوئی مسلمان مسلمان نہیں اور کوئی ہندو ہندو نہیں، ریاست کی نظر میں سب مساوی پاکستانی ہیں۔ اور کہا کہ پاکستان ایک جدید جمہوری ریاست ہوگی۔ اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ دو قومی نظریہ صرف پاکستان بنانے تک محدود تھا۔ منطقی اور سادہ فہمی سے بھی یہی حقیقت اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ برصغیر پر مسلمانوں نے ایک

ہزار سال حکمرانی کی تھی اور جب ان کا زوال ہوا تو یہ سماجی اور اقتصادی لحاظ سے محکوم ہندو اکثریت سے کئی گُنا نیچے گر چکے تھے۔ اس حالت کو پہنچنے میں ان کا اپنا ہی ہاتھ تھا۔ انگریزوں کے دور میں بھی مسلمانوں نے اپنی حالت سنوارنے کی کوشش نہ کی۔ جو بھی مواقع ملے ہندو اسے بڑھ کر سمیٹتے رہے۔ جب تاریخی مناظر بدلے، سامراجی حکمرانوں کو واپس جانا پڑا، تو مسلمانوں کی قیادت نے جائز طور پر یہ محسوس کیا کہ آزادی کے بعد وہ ہندو اکثریت کے مقابل اپنا سر نہ اُٹھا سکیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اس تاریخی موقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنے لیے ایک الگ مملکت کا مطالبہ کر دیا، جہاں وہ بلا شرکتِ غیرے اپنی دولت پیدا کر سکیں اور اسے اپنی اور اپنی آنے والے نسلوں کی بہبود کے لیے استعمال کر سکیں۔

لیکن پاکستان بننے کا اقتصادی جواز ملٹری اور سول بیوروکریسی کے مفادات کے خلاف تھا۔ انھوں نے اقتدار پر قبضہ کر کے پورا زور اس پروپیگنڈے پر لگا دیا کہ پاکستان (عوام کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں) اسلام کے نفاذ اور فروغ کے لیے بنا ہے۔ ''اسلام'' اس کا ''نفاذ'' اور ''فروغ'' سب تجریدی الفاظ اور خیالی نظریات ہیں۔ آج تک نہ تو کوئی انھیں define کر سکا ہے، نہ یہ کام کسی نے کبھی ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور نہ ہی یہ کام ابھی تک مکمل ہوا ہے۔ پاکستان کے عوام کی بہبود اور ملک کی ترقی ابھی تک انتظار میں بیٹھی ہے کہ کب پاکستان بننے کا یہ نام نہاد مشن پورا ہو۔ لیکن اسلام نہ نافذ ہوتا ہے نہ اس ملک کے وجود کے اصل مقصد کی سمجھ آتی ہے۔ نصف صدی سے اسلام جہاں تھا، آج بھی وہیں ہے، لیکن ریاست کی طرف سے اسلامی تناظر کو چھوڑ کر کسی اور طرح کی بات کرنے کی اجازت نہیں۔ زندگی کا کوئی بھی معاملہ ہو، اُٹھتے بیٹھتے ہر بات کے ساتھ اسلام کا سابقہ اور لاحقہ استعمال کرنا یہاں کے لوگوں کی ایک عادت بنا دی گئی ہے۔

اس ملک میں بار بار یاد دہانی کروائی جاتی ہے کہ چونکہ آپ مسلمان ہیں اس لیے پاکستانی ہیں۔ لہٰذا پاکستانی ہونا اصل نہیں، مسلمان ہونا اصل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم پاکستانی ہو کر نہیں سوچتے، مسلمان بن کر سوچتے ہیں۔ ہم نے پاکستان کے مفاد کو سامنے رکھ کر کبھی سوچا ہی نہیں۔ جب ہم عالمی امور میں اسلام کو معیار بنا کر تمیز کریں گے اور اسی پیمانے کو سامنے رکھ کر خارجہ پالیسی بنائیں گے، تو یقینی طور پر پاکستان کے مفادات کو نظر انداز کر دیں گے۔ پاکستان پر سب سے بڑا ظلم یہ کیا گیا ہے کہ اس پر نظریاتی ملک ہونے کا بوجھ ڈال دیا گیا۔ چنانچہ ہمارے حکمرانوں نے ہمیشہ خارجی اور داخلی میدانوں میں نظریے کی حفاظت کی، پاکستان کے مفادات کی نہیں۔ حتیٰ کہ وہ دولخت بھی ہو گیا۔ افغانستان کی جنگ ہم نے اسلامی نظریے کی خاطر لڑی، اسلحے اور ہیروئن کا کلچر، لاکھوں مہاجرین کا بوجھ، داخلی معیشت کی بربادی قبول کر لی۔ ہندوستان کے ساتھ تجارت اور اسے تیل اور گیس کی راہداری فراہم کرنا ہمارے مفاد میں ہے، لیکن نظریاتی مخاصمت آڑے رہی ہے۔ اسرائیل کے ساتھ خدا واسطے کا بیر ہے۔ عرب اسے تسلیم کر چکے ہیں، ہر طرح کے تعلقات بحال ہو رہے ہیں، وہ ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے ہیں، لیکن پاکستان میں اسرائیل کا نام لینا آج بھی جُرم ہے۔ پاکستان کی اسرائیل کے ساتھ براہِ راست کیا دشمنی ہے؟ حکمرانوں اور مولویوں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ نظریاتی ہونے کا مطلب مفت میں دوسروں کو اپنا دشمن بنانا ہے۔ چنانچہ خارجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی پالیسیاں بناتے وقت پاکستان کے مفادات کو قربان کرنا ہمارے حکمرانوں کے لیے کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ نظریاتی فرد ہو یا ریاست، اس کے لیے فرقہ پرست اور بنیاد پرست ہونا ضروری ہے، ورنہ وہ نظریاتی ہو نہیں سکتا۔ اور جب دنیا ہمیں فرقہ پرست اور بنیاد پرست کہتی ہے، تب بھی ہم بُرا منا جاتے ہیں اور مضحکہ خیز تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ہمارے حکمران اپنے بیانات میں دنیا کو باور کرانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان تنگ نظر ملک نہیں بلکہ ایک جدید مسلم ریاست ہے، لیکن آئینی، قانونی اور سماجی سطح پر سب کام اس کے برعکس کیے جاتے ہیں۔ پاکستان کو نظریاتی ریاست کہنے سے اس طرح کی ذمہ داریاں ہمارے اُوپر آ جاتی ہیں کہ ہمیں پاکستان اور اس کے عوام کے مفادات کو نظر انداز کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک ایسی قوم جسے اپنے مفادات کی پرواہی نہ ہو اور ہر جگہ نظریاتی لاٹھی چلا رہی ہو، وہ ترقی اور خوشحالی کی طرف کیسے بڑھ سکتی ہے؟

اس قوم کو بتایا گیا ہے کہ چونکہ تم مسلمان ہو اس لیے پاکستانی ہو، چنانچہ قومی اور اجتماعی زندگی کے جو بھی مسائل سامنے آتے ہیں حقائق کو سامنے رکھ کر منطقی اور آزادانہ فکر سے ان کا تجزیہ کرنے کی بجائے یہ سوچا جاتا ہے کہ مذہب کیا کہتا ہے۔ اور ظاہر ہے جو مولوی کہتا ہے وہی مذہب کہتا ہے۔ آج کے دور میں قومی مسائل کو متنازعہ، غیر سائنسی اور تقدیسی فارمولوں سے طے کرنے والی قوم کس طرح ترقی کی جانب قدم اُٹھا سکتی ہے، جب عقل، حقائق، زمانے کے تقاضے اور اپنے مفادات کو سامنے رکھنے کی بجائے یہی سوچنا ہے کہ اسلام کیا کہتا ہے۔ ظاہر ہے ایک ایسی قوم خیالوں میں ہی زندہ رہ سکتی ہے، اس کے مادی حقائق تلخ سے تلخ تر ہوتے جائیں گے۔ ہم کتنی اونچی قوم ہیں، اس کے لیے انسانی ترقی کے عالمی انڈکس پر اپنا نمبر تلاش نہیں کرتے، صرف ایمان یافتہ ہونا ہی کافی سمجھتے ہیں! کچھ عرصہ پہلے اسٹیبلش منٹ کی براہ راست سرپرستی میں جنونی، جنگجو اور جہادی تنظیموں کو فروغ دیا گیا۔ گاؤں گاؤں گلی گلی نوجوان شہیدوں کی لاشیں آتی رہیں۔ کنٹرول لائن کے پار خوب کافر مارے جاتے رہے۔ جنونی تعلیم کے مدرسوں اور مسلح تربیت کے کیمپوں تک ہر کسی پاکستانی کو کھلی ترغیب اور آسان رسائی میسر تھی۔ کوئی بازار اور مارکیٹ ایسی نہیں تھی جہاں اس کام کے لیے چندے اکٹھے نہ کیے جا رہے ہوں۔ کسی نے نہ سوچا کہ پاکستان رفتہ رفتہ تاریخ کے مہذب دائرے سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ جہادی اور مہم جو قوم کو دنیا میں کوئی پسند نہیں کرتا۔ یہ دنیا معاشیات اور سائنسی ترقی کی ہے، اور اس میں ہمارا نمبر صفر ہے۔

پاکستان چونکہ شریف اور ''نیک پروین'' قسم کی مخلوق کا وطن ہے، لہٰذا کہنہ اقدار اور فیوڈل اخلاقیات کی تبلیغ میڈیا اور تعلیمی نظام کا بنیادی جزو ہیں۔ پاکستان کو فخریہ سماجی لحاظ سے ایک رجعت پسند اور جامد ملک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اکثریتی آبادی کو اَن پڑھ اور جاہل رکھا ہوا ہے تاکہ وہ جدید اقدار کی طرف مائل نہ ہو سکیں۔ لوگ پس ماندہ ثقافت اور قدیم طرزِ زندگی میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ سماجی طور پر مردانہ اور زنانہ کے بیچ تفریق اور پردے کا نظام رائج ہے۔ قدامت پرستانہ فیملی سسٹم کی تحسین و توصیف کی جاتی ہے۔ اسے مسلمان اور پاکستانی ہونے کے لیے ناگزیر قرار دیا جاتا ہے۔ جدید طرزِ زندگی کو فحاشی قرار دیا جاتا ہے۔ ٹی وی کو گلیمر سے عاری، پردے اور سنسر کے سخت اور مضحکہ خیز اخلاقیاتی کوڈ نافذ کر کے اسے فیملی چینل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، خواہ لوگ اسے دیکھنا گوارا کریں یا نہ کریں۔ اتنا کنزرویٹو ہونے کے باوجود بھی ایک خاص جماعت کو PTV پر فحاشی نظر آ جاتی ہے! وہ ریاست کے پالیسی سازوں کو باور کراتے رہتے ہیں کہ خبردار، پالیسی میں نرمی نہیں کرنی!

چنانچہ جب ساری دنیا نئے علوم کی روشنی سے منور ہو رہی ہے، پاکستان دن بدن پیچھے کو جا رہا ہے، اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم ایسا پورے شعور اور فخر کے ساتھ کر رہے ہیں۔ مذہبی شدت پرستی، فرقہ واریت، طالبانائزیشن اور ملائیت کی تاریک دلدل میں پھنستے گئے۔ مولوی پیسے اور اسلحے سے لیس ہو گیا۔ وہ کسی بھی وقت اسلام کے نام پر سول سوسائٹی پر چڑھ سکتا ہے اور اپنے طالبان بھائیوں کی طرح پتھر کے زمانے کے قوانین کا نفاذ کر سکتا ہے۔ پاکستان کے قبائلی علاقے میں یہ عمل پہلے ہی شروع ہو چکا ہے۔ اس سارے عمل میں ملائیت کو اسٹیبلش منٹ اور ریاست کی ظاہری اور خفیہ ہر طرح کی مدد و حمایت حاصل ہے۔ سود کے نام پر جدید معاشی اور مالیاتی نظام کو بھی استوار ہونے سے روکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آگے بڑھنے کے سب سماجی، معاشی، ذہنی اور سیاسی راستے مسدود کیے جا رہے ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں پیداواری رشتے اور طریقے ابھی تک نہایت پس ماندہ سطح پر ہیں۔ ہر چیز کی چھوٹی سی منڈی ہے۔ منڈی کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے سرمائے کی پیداوار محدود رہ جاتی ہے۔ چنانچہ دولت کے حصول کے ناجائز ذرائع کا فروغ ہوتا ہے۔ کارکن جاہل اور غیر تربیت یافتہ ہیں۔ وہ دیہاتی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی پیداواری صلاحیت بہت کم اور ادنیٰ ہے۔ پورے ملک کا انفراسٹرکچر ٹوٹا پھوٹا ہے۔ وسیع تر بربادی و بدحالی میں خوشحال حکمران بیوروکریسی عوام کی دولت پر خوب عیش اور آرام کی زندگی گزار رہی ہے۔

جمہوریت بھی چونکہ اپنی نوعیت میں جدید سماجی نظریۂ حیات کی پیداوار ہے لہٰذا اس کی مستقل تذلیل کا عمل جاری ہے۔ اس کے بدلے

ازمنۂ وسطیٰ کے آمرانہ اور شخصی طرزِ حکومت کو افضل اور شفاف قرار دیا جاتا ہے۔ تعلیم اور ترقی کی بجائے بیشتر قومی سرمایہ ریاستی دفاع کے نام پر خرچ کر دیا جاتا ہے۔ خطے کے علاقائی تناؤ میں کمی کرنے کے لیے مخلصانہ کوشش نہیں کی جاتی، بلکہ فخر اور بے حسی سے کہا جاتا ہے کہ اس خطے میں اس وقت تک امن نہیں ہوگا اور ترقی نہیں ہو سکے گی جب تک فلاں مسئلہ ان کی مرضی اور منشا کے مطابق حل نہیں ہو پاتا۔ امن کے قائم نہ ہونے کی پروا نہیں ہوتی، ملک کی ترقی اور کروڑوں بدحال پاکستانی لوگوں کی زندگی سے دلچسپی نہیں، بس یہی ایک افضل حقیقت ہے کہ اس خطے میں دو دشمن قومیں رہتی ہیں۔ سارے وسائل آگ اور خون کے بہاؤ میں لگ جائیں، ہمیں کوئی پروا نہیں۔ ہندو پیدائشی اور تاریخی طور پر ہی ناقابلِ اعتبار، غدار، نیچ، ذلیل اور کافر ہے، اس کے ساتھ تصادم میں ہماری بقا اور شناخت ہے۔ ان مسائل کا ذکر ہم نے اس لیے یہاں کیا ہے کہ اس پالیسی پر قائم رہتے ہوئے پاکستان اور پاکستانی عوام کی معاشی، ذہنی اور ثقافتی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے ہماری پاک سوسائٹی، جو اپنے بنائے ہوئے نظریاتی حصار میں بند ہو چکی ہے، جس نے اپنے دروازے اور کھڑکیاں بند کر رکھے ہیں۔ مہذب اور ترقی یافتہ دنیا ہمیں رحم اور ترس کی نظروں سے دیکھ رہی ہے . . .

خوش ہونا منع ہے — یہ پاکستانی معاشرہ ہے!

اسلامی مملکتِ خداداد میں خوشی کی جبلّتوں کا اظہار لہو ولعب میں شمار اور مکروہ فعل سمجھا جاتا ہے۔ مور جنگل میں ناچ سکتا ہے، پرندے چہچہا سکتے ہیں، پانی کی ندیاں گنگنا سکتی ہیں، آبشاریں شور مچا سکتی ہیں، درختوں کی ٹہنیاں جھوم سکتی ہیں، لیکن پاک سرزمین پر اشرف المخلوقات کے لیے جشنِ حیات منانے (celerbration of life) کی گنجائش بہت محدود ہے۔ سماجی محفلوں اور تقریبات میں مرد وزن کا مل کر بیٹھنا، خوشی سے ناچنا گانا، ترنگ میں جھومنا، سماجی اور سرکاری لحاظ سے یہ سب نازیبا افعال ہیں۔ ایسا کرنے سے فحاشی اور بے حیائی کے فتوے لگتے ہیں، بڑے بوڑھوں کی بھنویں تن جاتی ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا اور سرکاری تقریبات پر ریاست نے سخت کوڈ مقرر کر رکھے ہیں، اور جہاں کوڈ مقرر نہیں بھی ہوتے، لوگ ڈر کے مارے خود پر سنسر آپ ہی لگا لیتے ہیں۔

چونکہ مذہبی بنیاد پرستی عام ہو رہی ہے لہٰذا ہر سماجی مقام پر کوئی نہ کوئی مذہبی شدت پرست ضرور موجود ہوتا ہے، جس نے سوسائٹی کی اصلاح اور اس کی اخلاقی حدود کی حفاظت کا ٹھیکہ اَز خود لے رکھا ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر محفل کی اکثریت بھی کسی ایسے عمل میں مشغول ہونا چاہے جو اس ٹھیکیدار کے نزدیک لہو ولعب ہے، تو اس اکیلے کی موجودگی سب کی تفریح حرام کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اکثریت بے شک بور ہو جائے، نوجوان کی خوشیوں پر پانی پھر جائے، خوشی کی محفل پر مُردنی چھا جائے، ایک شخص مذہب کے نام پر سارے معاشرے کو بلیک میل کرنے کے لیے کافی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کا حال یہ ہے کہ خواتین سروں کو دوپٹوں اور چادروں میں لپیٹے دبکی بیٹھی ہوتی ہیں۔ سہمی اور دبی ہوئی شخصیتوں کی مالک یہ اناؤنسرز اتنے دبے لہجے میں بات کرتی ہیں کہ دیکھنے اور سننے والوں کو نیند آنے لگے۔ ان کے ملنے جلنے اور ناظرین کے ساتھ ایک کھلے لہجے میں بات کرنے پر پابندی ہے۔ اس پاکیزہ کوڈ کے تحت خواتین گانا گا سکتی ہیں ناچ نہیں سکتی۔ اس پاکیزہ معاشرے میں فقط مرد ناچ سکتے ہیں! حالانکہ یہ معاشرہ مردوں کے ناچنے کو بھی معیوب سمجھتا ہے، ریاستی کوڈ میں پابہ زنجیر پی ٹی وی اپنے فنکشن کے لحاظ سے مجبور ہے کہ وہ لوگوں کو کچھ تفریح فراہم کرے، چنانچہ گانے بجانے اور رقص کا شوق فوک کلچر کے نام پر پورا کیا جاتا ہے۔ لوک رقص وموسیقی میں مُلّا کو فحاشی نظر آتی ہے لیکن اس کی تہذیبی جڑیں ہونے کی وجہ سے ملائیت کا بھی زور نہیں چلتا، اور دوسرے ملائیت کو فوک اس لیے بھی گوارا ہوتا ہے کہ فوک بذاتِ خود تبدیلی کے عمل میں ایک خاص قسم کی رکاوٹ ہوتا ہے۔ چنانچہ غیر شرعی ہونے کے باوجود مُلّا فوک رقص وموسیقی پر اعتراض نہیں کرتے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جدید، تیز، ہائی ٹیک اور گلیمر سے بھرپور دنیا میں فیوڈل زمانے کا لوک رنگ عوام کو کس حد تک ذہنی اور روحانی ریلیف دے سکتا ہے؟ میل (male) اور فی میل (female) نیوز ریڈر کے بیچ میں فاصلہ رکھا جاتا ہے کہ لگتا ہے دونوں ابھی ٹی وی کے کناروں سے باہر ہو جائیں گے! لیکن اسلامی جمہوریہ نے ایسا اس یقین دہانی کے لیے کیا ہوتا ہے کہ کہیں خبریں پڑھتے ہوئے دونوں سکرین پر ہی فحاشی نہ شروع کر دیں! یا پاک ناظرین نوجوان عورت اور مرد کو ساتھ دیکھ کر سفلی جذبات کی لپیٹ میں نہ آ جائیں!

مولوی کا اصل کام ترقی اور ذہنی کشادگی کو روکنا ہے۔ یہ کام جس طریقے سے بھی ہو جائے اسے بھاتا ہے۔ چنانچہ یہ قوم خوشی اور تفریح کے معنی بھول چکی ہے۔ یہاں پر خوشی کے دو بڑے تہوار عید کے نام سے منائے جاتے ہیں۔ چھوٹی عید کا انتظار اتنی دھوم دھام سے کیا جاتا ہے کہ لگتا ہے جب یہ تہوار آئے گا لوگ خوشی سے پاگل ہو جائیں گے۔ عید آ رہی ہے! عید آ رہی ہے! سب کی زبان پر یہی الفاظ ہوتے ہیں، جیسے انبساط ومسرت کا کوئی طوفان اُٹھنے والا ہے۔ اور پھر وہ سعید دن آ جاتا ہے۔ سب ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ اب کرنا کیا ہے؟ خوشی کا عظیم ترین دن، اور خوشی کے اظہار کی کوئی صورت نہیں! بڑے بوڑھے کھسیانے ہو کر ایک دوسرے کو کہنے لگتے ہیں: ''عید تو بچوں کی ہوتی ہے۔'' مصنوعی خوشی کے تاثر کو نبھانے کے لیے ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ خصوصی طور پر تیار شدہ کھانوں پر ٹوٹ پڑا جائے،

چنانچہ اس ملک میں خوشی کا مطلب کھانا کھانا ہے۔ خوشی کا کوئی بھی موقع ہو، تان کھانے پر ٹوٹتی ہے۔ کسی بھی تقریب کا لبِ لباب بس کھانا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم مفت کا کھانا خوب ٹوٹ کر کھاتے ہیں۔ لگتا ہے صدیوں کے بھوکے ہیں۔ اصل میں بھوک روحانی اور ذہنی ہے، پوری خوراک سے کی جاتی ہے! مفت کا کھانا کھا کر خوش ہوا جاتا ہے۔ ہنسنے کھیلنے اور ناچنے گانے پر پابندی ہے۔ مرد و زن کا سماجی اختلاط عمومی طور پر ناپید ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی سماجی رفاقت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان کے نزدیک عورت اور مرد کے ملنے کا ایک ہی مطلب ہے، اور وہ ہے سیکس۔ مرد و زن صاحبِ شعور (intellectual) ہستیاں نہیں، محض حیوانی اور جنسی پُتلے ہیں۔ اگر دو گھڑی ساتھ بیٹھ لیے یا آپس میں ہنس دیے، تو رشتوں ناتوں کی ساری تقدیس کو فوری پامال کر دیں گے۔ چنانچہ مرد و زن کو الگ الگ رکھنے کی وجہ سے دونوں اصناف کے فریقوں میں جنسی حساسیت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ سماجی سطح پر اگر لمحے بھر کے لیے ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں تو خوامخواہ اپنے اپنے طور پر خود کو مجرم (guilty) محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اس سوسائٹی میں دونوں فریق ذہنی طور پر مریض ہو چکے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے دور رہ کر اپنے کردار کی صفائی کا ثبوت دینے کی لاشعوری سعی کرتے ہیں۔ لیکن مرد و زن کا سماجی طور پر ایک دوسرے سے دور ہونا دراصل اس فطری خوشی کی موت ہے جسے ایک دوسرے کے پاس رہ کر دونوں حاصل کر سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ ظلم نوجوان نسل پر ہے جن کے وجود سے خوشیاں خود بخود پھوٹنے کا وقت ہوتا ہے۔ عمومی گھٹن کی فضا میں غیر مخلوط سوسائٹی کی وجہ سے ان کی فطری خوشیاں مرجھا کر رہ جاتی ہیں، شخصیتیں دب جاتی ہیں۔ انھیں زندگی کے حقیقی لطف سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ان کے لیے زندگی کا مطلب ایک حیوانی سطح کی خشک روٹین ہو جاتا ہے، چنانچہ وہ بھی عدم سلامتی (sense of insecurity) کے مارے نفسیاتی مریض ہو کر بعد ازاں اس قوم کی بزرگ نسل بنتے ہیں۔ چونکہ وہ خود زندگی کے فطری لطائف سے محروم رہے ہوتے ہیں، چنانچہ انتقام کے طور پر اپنی نئی نسل کو بھی ان سے محروم رکھتے ہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں آپس میں مل بیٹھ نہیں سکتے، ہنس کھیل نہیں سکتے، ایک دوسرے کے دوست نہیں بن سکتے، کسی فنکشن میں اپنے پسندیدہ آرٹسٹ کے ساتھ ناچ گانے میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہاں شرافت اسے کہتے ہیں کہ جذبات پر پابندیاں لگائیں، احساسات کو دبائیں، پھول کی طرح خود کو کھلنے نہ دیں، اس لاثانی اور ایک بار کے جیون کو روگ اور سوگ میں بدل دیں، زندگی کے سانس اُس ذات کی پوجا پاٹ میں وقف کر دیں جو بقول ان کے پوجا پاٹ کا محتاج ہی نہیں۔ زندگی سے نفی کا نام پرہیزگاری ہے۔ یہ تنگ نظر خود کو خدا سے زیادہ دانشور سمجھتے ہیں جس نے جسم، روح اور ماحول کی سب خوبصورتیاں پیدا کیں تاکہ ہم ان سے لطف اندوز ہو سکیں۔ یہی حقیقی عبادت ہے کہ زندگی بھر پور طریقے سے گزاری جائے، اس کے ایک ایک لمحے سے لطف و آگہی کا رس کشید کیا جائے، تاکہ موت آئے تو پورے اطمینان کے ساتھ اس جیتی جاگتی دنیا سے رخصت ہوا جائے، کہ قدرت نے جو بھی جیون کے نام پر بخشا تھا، اسے جی بھر کر گزارا ہے۔

سب سے زیادہ شامت لڑکی ذات کی آتی ہے۔ اس کے معاملے میں یہ معاشرہ نہایت مجرمانہ خیالات کا حامل ہے۔ پاکیزگی، صالحیت اور شرافت کے نام پر یہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتا ہے۔ اس فرسودہ تہذیب میں لڑکیوں کو جیسے کچلتے ہیں، وہ جدید ذہن کے لیے بڑا ہی اذیت ناک ہے۔ اس معاشرے کے نزدیک اخلاق بڑا ہے، انسان چھوٹا ہے۔ یہ خود ساختہ اخلاقیات کے نام پر انسان کو مسخ کر دیتے ہیں۔ عورت کی عزت بچانے کے لیے اسی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اس کا وجود اور بدن ہی اس کے لیے دعوتِ گناہ بن کر رہ جاتا ہے۔ لڑکی کے پیدا ہوتے ہی خاندان میں عزت کی حفاظت کا احساس جاگ پڑتا ہے، گویا ایک خطرناک چیز نے جنم لے لیا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات انتہائی محدود کر دی جاتی ہیں، اسے برقعوں، پردوں، چادروں اور دوپٹوں میں ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ حرکتیں وہ افراد کر رہے ہوتے ہیں جو خود کو صالح اور پاکباز گردانتے ہیں۔ اگر یہ لوگ صالح اور پاکباز ہیں تو پھر ان حرکتوں کا مطلب کیا ہے؟ عورت کو آپ سے اور آپ کو عورت سے خطرہ کیوں محسوس ہوتا ہے؟ دراصل صالحیت کے نام پر یہ لوگ نیتوں میں کھوٹ کی سوسائٹی تعمیر کرتے ہیں۔

اس ملک کی جغرافیائی رنگارنگی اور قدیم تہذیبوں کی وارث تاریخی زمین میں دنیا بھر سے ٹورازم کو کھینچنے کی زبردست استعداد موجود ہے۔ دریا، ریگستان، برف پوش پہاڑی سلسلے اور سرسبز وادیاں موجود ہیں۔ غیر ملکی کرنسی کمانے کا اتنا بڑا وسیلہ محض ریاست کی رجعت پسند نہ آئیڈیالوجی کی وجہ سے بے کار پڑا ہے۔ ہمسایہ ملک کے ساتھ تصادم کے شوق میں جس ملک نے اپنا امن ہمیشہ کے لیے گروی رکھ چھوڑا ہو، جہاں ''بیرونی ہاتھ'' والے دہشت گردی کے واقعات معمول ہوں، جس ملک میں جنگ کی باتیں اچانک شروع ہو جائیں، جہاں بنیاد پرست

جہادی مسلح تنظیمیں کھلم کھلا جنگ جوئی کی تبلیغ کرتی ہوں، فرقہ وارانہ تشدد عام ہو؛ جو قوم اپنی تاریخی جڑوں سے اس لیے نفرت کرتی ہو کہ ان کے آباواجداد کے اعتقادات ان کے آج کے مذہب سے مطابقت نہیں رکھتے تھے؛ جو قوم اپنی زمین کو تاخت وتاراج کرنے والے بیرونی حملہ آوروں کی محض اس لیے حمایت کرے کہ وہ ان کے ہم مذہب تھے؛ وہ قوم جو ہو جنوبی ایشیائی لیکن عرب و فارس کی تاریخ کو اپنی تاریخ کہنے سے نہ شرمائے، ایسی قوم خواہ کتنی ہی خوبصورت دھرتی میں کیوں نہ بستی ہو، عالمی برادری میں باعزت مقام کسی طرح پا سکتی ہے؟ ترقی یافتہ قوموں کے افراد سیر وتفریح اور تہذیب سے آگاہی کے لیے کس طرح آ سکتے ہیں؟ اور اگر کوئی بھولا بھٹکا آ ہی جائے، انفراسٹرکچر کی پسماندگی کا ذکر چھوڑ بھی دیں، اس کو اس ملک میں تفریح نام کی چیز کون سی ملے گی؟ ہر طرف ممنوعات اور سخت اخلاقیاتی کوڈ کی خشکی چھائی ہوئی ہے۔ ہمارے پاس غیر ملکیوں کی کشش کے لیے ہے کیا؟ بور، سنجیدہ، خشک ماحول، نہ پینے کی آزادی، نہ ساحلوں پر سن باتھ کی، نہ کھیلوں کی سہولتیں، نہ ہوٹلوں میں رقص وسرود۔ زہد وتقویٰ (asceticism) کا گاہک کم از کم اُس ہستی بستی ترقی یافتہ دنیا میں تو کوئی نہیں؛ یہ حرکت آخرت کی شوقین قومیں ہی کر سکتی ہیں جنھیں اس دنیا کی بربادی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

ہمارے ہاں تہذیبی، موسمی اور عالمی تہوار منانے پر کفر کے فتوے لگ جاتے ہیں کہ لوگ کسی بہانے خوش کیوں ہونے لگے۔ پوری دنیا میں قوموں کے رنگارنگ جشنِ مسرت (carnival) دیکھنے والی چیز ہوتے ہیں۔ اس ملک میں کسی عوامی میلے اور جلوس کا کوئی تصور نہیں جس میں عوام اپنی خوشی اور مستی کا بھرپور اظہار کر سکیں۔ لاہوریوں کی سخت جانی نے بسنت کا تہوار بچا رکھا ہے، جس میں کچھ ڈھول تماشے، ہاوہو، گانا بجانا اور خاندان کے مرد وزن کی شرکت کا کسی حد تک رواج ہے۔ بنیاد پرستوں نے اس پر پابندی لگوانے کے کئی بہانے تراشے ہیں، لیکن شاید میڈیا اور سرکار کو احساس ہے کہ عوام کے ذہنی دباؤ کے اخراج کے لیے کچھ تو رستہ کھلا رہے ورنہ لوگ گھٹ کر مر جائیں گے۔ سالِ نو (New Year) کی آمد پر اس ملک کی حالت قابلِ دید ہوتی ہے۔ قوم کو خوشی جیسی ''فحاشی'' سے بچانے کے لیے ہماری اسٹیبلشمنٹ ایک بنیاد پرست جماعت کے دباؤ میں پورے ملک کو سرِشام قبرستان بنانے کے احکامات جاری کر دیتی ہے۔ شاپنگ مال شام ہی شام بند کروا دیے جاتے ہیں کہ کہیں کوئی شخص نیو ائیر منانے کے گناہ کا مرتکب ہی نہ ہو جائے۔ ہوٹلوں کو خصوصی طور پر وارننگ دی جاتی ہے کہ خبردار جو اس عالمی تہوار پر کوئی تقریب منعقد کی یا اپنے گاہکوں کے لیے تفریح کا کوئی سامان بہم کیا۔ یہ اس رات کی بات ہے جب ساری دنیا عقیدے اور رنگ ونسل کے امتیاز کے بغیر نئے سال کے آنے کا والہانہ استقبال کر رہی ہوتی ہے۔ لیکن ہم اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جس کا وقت (time) کے ساتھ کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ ہم وقت کی رفتار اور تاریخ سے ماورا ہیں۔ ہمارا زندہ ہونے کا اپنا ہی مشن ہے جس کا اس مادی دنیا کے قوانین سے کوئی واسطہ نہیں! شاید اسی لیے تاریخ اور وقت بھی ہمیں بھلا چکے ہیں۔ ترقی یافتہ قوموں کی غلامی اور ذلت آمیز پسماندگی ہمارا مقدر رہے۔ ہم عجیب روحانی فلاسفی پر ایمان رکھتے ہیں جو یہ سکھاتی ہے کہ ہم زندگی کے لیے نہیں، خدا کی خاطر زندہ ہیں!

خوشی اور تفریح سے محرومی کا سب سے بڑا عذاب نوجوان نسل پر وارد ہوتا ہے، اس لیے کہ جوانی کے دور کا مطلب ہی جشنِ حیات (celeberation of life) ہے۔ فطرت نے جوانی کو پروگرام ہی ایسا کیا ہے۔ یہ وہ رومانی دور ہے، جسے وقت بھی جھک کر سلام پیش کرتا ہے۔ جوانی مستی میں ڈوبنے، کھل اٹھنے اور زندگی کے روشن پہلو دیکھنے کا نام ہے، لیکن اس ملک میں بیشتر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تو ایسے ہوتے ہیں کہ جوانی جن پر ایک خواب کی طرح آتی ہے۔ وہ بچپن سے سیدھا بڑھاپے میں قدم رکھتے ہیں۔ جوانی کو معاشی بدحالی اور سماجی گھٹن دیمک کی طرح چٹ کر جاتی ہے۔ حسن وعشق کی سرمستیاں اس کے لیے محض ایک ہیولا ہوتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ معاشرہ جوانی کو کچل دینے والا معاشرہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہمارے پاس نوجوانوں کی تفریح اور خوشی کے لیے کچھ نہیں ہے۔ گھریلو ماحول عموماً گھٹن زدہ ہوتا ہے۔ اسکول جاتے ہیں تو وہاں ان اساتذہ کی کمی نہیں ہوتی جو ہر وقت ان کی جواں سالی کو مریضانہ اخلاقیات کے لیکچر دے کر ثوابِ دارین حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ سوسائٹی اور ریاست نے خوشی اور تفریح کے اظہار کے کوئی بندوبست (outlet) نہیں کر رکھے۔ پارکوں میں جوڑوں (couples) سے پولیس نکاح نامہ مانگتی ہے۔ کئی خدائی رضاکار ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی بھی جوڑے کو قریب دیکھ کر بوس وکنار کے الزام میں حوالۂ پولیس کر سکتے ہیں۔ لوگوں کی خلوت (privacy) میں صریحاً مداخلت اس ملک میں قانونی طور پر جائز ہے۔ کیا ہم

مہذب دنیا کا حصہ قرار دیے جاسکتے ہیں؟ اس سماج میں جنسی خوشی کا تعارف فقط شادی کے ساتھ مشروط ہے۔ جنسی اور افزائشِ نسل کے موضوعات پر بات کرنا ممنوع (taboo) ہے۔ چنانچہ جنس اس معاشرے کا سب سے بڑا خفیہ (secret) معاملہ ہے۔ ظاہراً ایسے لگتا ہے کہ جنس کا اس معاشرے میں کوئی وجود نہیں۔ یہاں جنسی اختلاط کے فطری طریقے سے کوئی پیدا نہیں ہوتا! یہ سب لوگ سیدھے آسمان سے اُترتے ہیں۔ ماں باپ بھی فطری جوڑا کم، بہن بھائی زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ جب بچوں کو بڑے ہوکر جنسی شعور ملتا ہے تو ماں باپ کی فنکاری پر حیرانی ہوتی ہے کہ انھوں نے ہمیں کس وقت پیدا کیا تھا۔ جس قدر اخلاق زدہ سماج جنس کا دشمن ہے، فطرت کو اتنی ہی زیادہ جنس سے دلچسپی ہے۔ بچے کو چھوٹی سی عمر میں جنسی تحریک ہونے اور جنسی طریقے سے افزائشِ نسل کرانے میں قدرت کو شرم نہیں اور ہم قدرت سے بھی زیادہ پاک باز ٹھہرے ہیں۔ اگر خدا ہمارے سامنے اس طریقے کو اختیار کرنے کا سوچتا تو ہم اسے ایسا ''گندہ اور بے شرم'' طریقہ اپنانے سے ضرور روکتے! لیکن اب ہو تو کچھ نہیں سکتا، لیکن جنس کو جتنا زیرِ زمین (underground) کیا جاسکتا ہے اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔ چنانچہ ہمارے بچے کسی بھی طرح کی جنسی تعلیم اور معلومات کے بغیر جوان ہوتے ہیں۔ انھیں فطرت کے یہ مسائل خود ہی خفیہ طریقے سے نمٹانے ہوتے ہیں— اور پھر اس سلسلے میں ان کی جس طرح بربادی ہوتی ہے اس کی ایک الگ کہانی ہے۔ جنسی مریضوں کی نوجوان نسل بلوغت میں قدم رکھتی ہے۔ ہمارے ایک بزرگ دانشور ادیب ساتھی کا کہنا ہے کہ اس المیے پر کون کتاب لکھے گا جس سے ہمارا نوجوان لڑکا لڑکی تیرہ سال سے شادی کی عمر تک (جو آج کل تیس سال کے قریب ہوگئی ہے) گزرتا ہے؟ وہ اس دوران اس فطری خواہش کی تسکین کے لیے کیا کیا کچھ کرتا ہے اور فطری خواہشوں کے یہ حسین ترین اور پھٹ پڑنے والے سال جس اکلاپے کی بھینٹ چڑھتے ہیں، اس کا حساب کتاب کس طرح ہوگا؟ کیا یہ المیہ کس سماجی سائنس اور تحقیق کا موضوع نہیں بن سکتا؟ اس معاشرے کی شرافت اور نیکی کا بھیانک پردہ کون چاک کرے گا؟ ہماری نسلیں ہم جنسیت، خود لذتیت، خفیہ ناجائز مباشرتوں اور اندر سے ٹوٹتی، تڑپتی، الجھنوں سے گزرتی کہیں جاکر شادی کے کنارے لگتی ہے۔ شادی بنیادی طور پر اس معاشرے میں جنسی اختلاط کے لائسنس کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ خاندان کی تشکیل اور بچوں کا خیال بعد میں آتا ہے۔ شادی عموماً اس معاشرے میں بالکل انجانے دو افراد کے درمیان ہوتی ہے جو جدید دور کے لیے ایک مضحکہ خیز اور ناقابلِ یقین حرکت ہے۔ کسی رومانی مدت سے گزرے بغیر نو بیاہتا جوڑے کے سر پر پچھلے سترہ اٹھارہ سال کے جنسی خمار، خبط اور دباؤ سے آزاد (release) ہونا ہی سب سے اہم مرحلہ ہوتا ہے، جو سو طرح کی نفسیاتی اُلجھنوں، گناہ اور پلید کے غیر سائنسی تصورات اور خام معلومات کے جلو میں انجام پاتا ہے۔ اگر تحقیق کی جائے تو پتا چلے گا اس قوم کی شادی شدہ آبادی بھی عالمی معیار کے مطابق کئی گنا جنسی لذت سے محروم ہوگی۔ گویا حقیقی جنسی لذت اس قوم کے مقدر میں ہی نہیں، خواہ وہ شادی کرکے جنسی اختلاط کا مذہبی اور قانونی لائسنس ہی کیوں نہ لے لے، کیونکہ مذہبی اور سماجی اخلاقیات کے تصورات بیڈروم تک ساتھ جاتے ہیں جو حقیقی جنسی لذت اور خوشی سے محروم کردیتے ہیں اور جنسی اختلاط محض ایک میکانکی عمل ہوکر رہ جاتا ہے۔ ہم کتنے مسخ شدہ انسان ہیں اس کی تحقیق کے لیے ہمیں کئی سو گمنڈ فرائڈ چاہیے ہوں گے!

تیس سال کے قریب شادی ہوتی ہے۔ اگر ازدواجی زندگی میں دیگر بحران پیدا نہ ہوں، باقی ماندہ جوانی کا کچھ عرصہ قدرے خوشی میں گزر جاتا ہے۔ ویسے میاں بیوی کا اکٹھے بیٹھنا، بانہیں ڈال کر یا ہاتھ پکڑ کر ساتھ چلنا، ایک دوسرے کا بوسہ لینا معیوب حرکتیں ہیں۔ گویا وہ سب خوشیاں جن پر کوئی پیسہ خرچ نہیں ہوتا اور وہ جائز رشتوں کے درمیان ہیں، ان کی بھی سماج کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔ جونہی ان شادی شدہ جوڑوں کے بچے ذرا بڑی عمر کو پہنچتے ہیں، خاص طور پر اگر ان کی کوئی بیٹی ہو، تو ان پر پاکیزگی اور شریفانہ ماحول کا دورہ پڑ جاتا ہے اور گھر میں وہی سخت اخلاقی ضوابط دہرائے جانے شروع ہوجاتے ہیں جو ان کے والدین نے قائم کر رکھے تھے۔ اور یوں معاشرہ جہاں پچھلی نسل پر تھا، وہیں کھڑا رہتا ہے۔ اقدار اور فکر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو پاتی۔

لیکن اس ملک کا جو گاڈ فادر حکمران طبقہ ہے وہ زندگی کے تمام جمالیاتی پہلوؤں سے بھرپور لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان کی اپنی نجی زندگی ہر طرح کی تماش بینی اور عیاشی سے بھری ہوتی ہے۔ اخلاقیات کے سارے لیکچر اور ضوابط فقط غریب عوام کے لیے ہوتے ہیں۔ طاقت ور امرا طبقات زندگی کی ساری حسین نعمتوں کے خوب مزے لوٹتے ہیں۔ جو کچھ وہ اس ملک کے اندر نہیں کرسکتے، بیرونِ ملک سرکاری یا تفریحی دوروں میں اس کی ساری کسر نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں اخلاقی ضوابط نہیں دراصل منافقت رائج ہے۔ زور آور کے لیے سب جائز ہے اور

عام آدمی کے لیے ہر طرح کی خوشی کا وسیلہ حرام ہے اور اس کی دسترس سے باہر بھی ہے۔ پابندیوں کا مطلب خوشی کے وسیلے کا مہنگا کرنا ہوتا ہے۔ اس ملک میں ہمیشہ سامانِ تعیش، شراب، کباب، ہر اُس کو شخص میسر ہیں جو انھیں حاصل کرنے کی استعداد رکھتا ہے اور یہ سب لوگ اسلامی جمہوریہ کے معزز اور ممتاز شہریوں میں شمار ہوتے ہیں۔ منافقت کے اس کھیل میں سیاست دان، باوردی اور سول بیورو کریٹ، جاگیردار، تاجر، صنعت کار، دینی رہنما، ادیب، شاعر، صحافی، مدیرانِ جرائد اور دانشور سب شامل ہیں۔ ساری نیکی اور پرہیزگاری عام آدمی کے لیے رکھ چھوڑی گئی ہے۔ چنانچہ درمیانہ طبقے کو صرف روزگار، تعلیم اور صحت کے مطالبے ہی نہیں، حکمران طبقات سے زندگی کی دیگر خوبصورتیاں بھی مانگنی چاہئیں۔

ایک سوال یہ اُٹھتا ہے کہ جو طبقہ زندگی کے تمام جمالیاتی پہلوؤں سے لطف اندوز ہوتا ہے کہ کم از کم اس میں تو وہ خوبیاں پیدا ہو جانی چاہئیں جو مہذب معاشروں کے لوگوں میں ہوتی ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں کے حکمران اپنے اپنے عوام کو جاہل اور پسماندہ کیوں رکھنا چاہتے ہیں؟ اس کی ایک ہی توجیہہ کی جاسکتی ہے کہ ان کی تمام عیاشانہ زندگی کا انحصار ان غریب عوام کے استحصال سے کمائی ہوئی دولت پر ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ عوام جاگ پڑیں، انھیں اپنے مفادات کا شعور حاصل ہو جائے اور وہ بھی زندگی کے معنی جان جائیں۔ صرف تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھنے سے سائنسی اور انسانیت ساز سوچ پیدا نہیں ہو جاتی۔ بنیادی رویے اور کردار طبقاتی مفاد ادا کرتا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کے حکمرانوں کا یہ مسئلہ نہیں ہے۔ اُن اقوام کی عمومی ترقی کی وجہ سے وہاں اتنی قومی دولت پیدا ہو جاتی ہے کہ بالائی طبقے کو عوام کا گلا گھونٹے رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب کہ ترقی پذیر ملکوں میں اگر حکمران ایسا نہ کریں تو وہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے۔

عزت، غیرت اور شرم تلے عورت

عزت کیا ہے؟ لغت کے مطابق ''کسی شخص کی قدر اس کی اپنی نظروں میں'' (value of a person in one's own eyes) اور تعریف کے مطابق ''وہ ضوابط جو روایتی معیارِ کردار تشکیل کرتے ہیں'' (rules forming conventional standard of conduct)۔

لیکن عزت ایک اور بھی ہے، جس کا ہم یہاں ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ عورت کے جنسی کردار کو بھی عزت کہتے ہیں۔ ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں، یہاں عورت کو اپنی جنس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس کی ذاتی زندگی اور مستقبل کے بارے میں سب فیصلے اس کے مرد رشتے داروں نے کرنے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بچی جب کسی کے گھر پیدا ہوتی ہے، اس کے خاندان میں محض ایک فرد کا اضافہ نہیں ہوتا بلکہ ایک ''مسئلے'' کی آمد ہوتی ہے، اور وہ ہے ''عزت'' کا مسئلہ۔ بیٹی کی پیدائش پر مرد رشتے داروں کے سر اندر ہی اندر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ بیٹی کا باپ اور بہن کا بھائی کہلوانا کوئی فخر کی بات نہیں، اس لیے کہ وہ محض بیٹی یا بہن ہی نہیں، وہ ایک شرمناک چیز ہے۔ ایک ایسی ہستی ہے جو پاک باز معاشرے میں سب سے زیادہ غیر محفوظ ہے! اور سارا مرد معاشرہ جس کی تاک لگائے بیٹھا ہے۔ اور اگر خدا خدا کر کے اس کی بلوغت تک اس کی عزت بچانے میں کامیاب رہیں، پھر بھی ایک دن سر جھکا کر کسی مرد کے حوالے کرنا ہوتا ہے۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ بیٹی کی وجہ سے مردوں کی مردانہ قسم کی حرکتیں کم ہو جاتی ہیں اور وہ سوسائٹی کے سامنے شرمندہ سے رہتے ہیں۔ بیٹی نہ فرد ہے اور نہ انسان، وہ ایک غیر محفوظ (vulnerable) قسم کی چیز ہے جس کی ہر دم حفاظت ضروری ہے۔ ''خطرہ'' اس قدر شدید ہوتا ہے کہ بچپن سے ہی لڑکیوں کے لیے اونچا بولنا اور ہنسنا منع کر دیا جاتا ہے، اس لیے کہ اگر بچی کو چھوٹی عمر میں ہی کنٹرول نہ کیا گیا تو وہ بڑی ہو کر رسوائی کا سبب ہو سکتی ہے۔ لہٰذا چھوٹی عمر میں ہی بچی کو سمجھ آ جاتی ہے کہ کون سی بات خاندان کے لیے شرمناک اور خلافِ عزت ہے۔ عورت کو کنٹرول کرنے میں نہ صرف فیوڈل اور قبائلی سماجی اقدار کا سہارا لیا جاتا ہے، بلکہ مذہب بھی اس سلسلے میں ایک ہتھیار کا کام کرتا ہے۔ مردوں کے لیے عورت کو اس کا کمتر اسٹیٹس (status) یاد کروانے کے لیے یہ سطر ہی کافی ہے کہ ''مرد ہی عورتوں کے محافظ اور وہی ان کی کفالت کرنے والے ہیں، کیونکہ خدا نے بعضوں کو بعض پر فوقیت دی ہے۔''

غریب اور قبائلی علاقے میں لڑکی کے جنسی رویے پر ذرا سا شک اس کے قتل کا سبب بن سکتا ہے۔ جب کہ شہری مڈل کلاس کی لڑکی کو کسی ایسے الزام کے نتیجے میں گھر کے کمرے میں بند کر تشدد کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے، اسے اخلاقیات اور خاندان کی عزت پر لیکچر دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ خاندان کا نظریہ عورت کے اندر احساسِ گناہ (guilt) پیدا کرتا ہے۔ ایسے معاشروں میں عورتیں خود بھی عورتوں کے سوشل کنٹرول کا ذریعہ بنتی ہیں۔ خواتین کی آپس میں گپ بازی (gossip) کسی دوسری عورت کو طے شدہ ضوابط کے باہر جانے سے روکتی ہے، اس لیے کہ نیک نامی (moral reputation) اس قدر اہم ہوتی ہے کہ ذرا سی افواہ کسی عورت کی زندگی برباد کر سکتی ہے۔ عورت کا گھر والوں کی توقعات پر پورا اترنا نہایت اہم ہے، اور لڑکیوں کی تربیت (conditioning) ایسی کی جاتی ہے کہ وہ خود بخود اس طرح محسوس کرنے لگیں۔ کسی عورت نے جونہی ادھر اُدھر تانک جھانک یا کسی مرد سے دوستی کی، وہ بات فوراً دوسری عورتوں کے ذریعے افواہ بن کر پورے خاندان اور آبادی میں گھوم جاتی ہے۔ عورت پر ظلم مرد کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور عورت کی طرف سے بھی، بلکہ شاید زیادہ ظلم خود اپنی ہی ہم جنس کی طرف سے ہوتا ہے۔ ماں، ساس، دیگر بوڑھی رشتے دار عورتیں اور ہمسائیاں سب عورت کو مردوں کے بنائے ہوئے ضابطۂ اخلاق میں باندھنے میں مدد کرتی ہیں۔ اس کے بعد ہمارے ہاں بچیوں اور نوجوان لڑکیوں کو کنٹرول کرنے میں ان کے اسکولوں کی اُستانیاں بھی بڑا رول ادا کرتی ہیں۔ یہ سوشیالوجی کا بڑا اہم سوال ہونا چاہیے کہ عورتیں عورت کی دشمن کیوں ہیں۔ جذبۂ انتقام کے تحت؟ سب ظلم اور پابندیاں ان پر ڈھائی گئیں، لہٰذا ان کی کوئی ہم جنس ان زیادتیوں سے کیوں بچے۔ لیکن اس کا سارا فائدہ مردوں کو ہوتا ہے۔ ان کے بنائے ہوئے نظام کی

حفاظت عورتیں خود ہی کرنے لگ جاتی ہیں۔ بسا اوقات شدید پابندیوں والے گھرانے کی لڑکیاں کسی بھی مرد کے ساتھ شادی کر کے اپنے ماں باپ کے گھر کو جلد از جلد چھوڑ دینے کو ترجیح دیتی ہیں یا کسی بھی ایسے آدمی کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں جو ان کے ساتھ ہمدردی کے دو بول بولتا ہے۔

چونکہ عزت کو عورت کے جنسی رویے سے منسلک کیا جاتا ہے، چنانچہ لڑکیوں کی شکل وصورت اور ان کے لباس کی وضع قطع بہت اہم ہو جاتے ہیں۔ سوسائٹی میں ان کے جو معیار رائج ہوتے ہیں، لڑکیوں کو اس کی سختی سے پابندی کرنے کو کہا جاتا ہے۔ ان کو مسلسل یاد کروایا جاتا ہے کہ وہ اپنا دوپٹہ یا چادر اوپر لیں۔ انھیں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھنے سے منع کیا جاتا ہے۔ انھیں بات کس طرح کرنی چاہیے، ان کی چال کس طرح کی ہونی چاہیے۔ اجنبی سے آنکھیں ملا کر بات نہیں کرنی، تنگ اور جسمانی خدوخال کو ابھارنے والے کپڑے نہیں پہننے، اکیلے کہیں نہیں جانا، مہمانوں کے پاس نہیں بیٹھنا۔ چھوٹی عمر میں ہی بچی کو دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنا بند کروا دیا جاتا ہے۔ وقتی طور پر بچی پریشان ہو سکتی ہے کہ اس کے ساتھ امتیازی سلوک کیوں کیا جا رہا ہے، اس کی ذات میں کیا خرابی ہے، کیوں وہ نارمل انسان کی طرح نہیں رہ سکتی؟ ظاہر ہے اس کی شخصیت ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن جلد ہی ان ٹکڑوں کو جوڑ کر وہ خود کو اس کردار کے لیے تیار کرتی ہے جو سوسائٹی نے اس کے لیے تجویز کیا ہوتا ہے۔ بچی کو کہا جاتا ہے کہ یہ سب تمھاری بھلائی کے لیے ہے۔ چنانچہ بہت سی عورتیں فرمانبردار ہونے میں فخر محسوس کرنے لگ جاتی ہیں، اور وہ سب کچھ کر کے جو سماج ان سے توقع کرتا ہے، مزید پابندیوں سے بچنے کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ اگر لڑکی ان غیر تحریر شدہ قوانین پر عمل نہیں کرتی تو ماں باپ اس لڑکی کے مستقبل کے بارے میں خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔

عربی زبان میں کنوارپن کے لیے ''عذرا'' (virgin) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ غور طلب بات ہے کہ اس کے متبادل میں مردوں کے لیے اسی طرح کا معنی دینے والا کوئی مذکر لفظ موجود نہیں ہے۔ یعنی کنوارپن صرف لڑکی کے لیے ہے، مرد کے لیے نہیں۔ کنوارے مرد کے لیے کہا جائے گا کہ ابھی اس نے کوئی جنسی تجربہ نہیں کیا۔ جو لڑکی اپنا کنوارپن کھو بیٹھے، اسے جسمانی یا اخلاقی موت دے دی جاتی ہے۔ شادی کی رات اگر وہ سماج کے خود ساختہ معیار کے مطابق ''کنواری'' نہیں پائی گئی تو صبح اسے طلاق دی جا سکتی ہے اور یہ طلاق اسکینڈل کے ساتھ وابستہ کر کے دی جائے گی اور آناً فاناً محلے برادری میں خبر پھیل جائے گی۔ ایسی لڑکی معصوم ہی کیوں نہ ہو، لیکن وہ اسے ثابت نہیں کر سکتی۔ عرب ممالک میں لڑکیاں شادی سے پہلے ڈاکٹر سے پوچھنے جاتی ہیں کہ آیا ان کا پردۂ بکارت ابھی اصلی حالت میں ہے یا نہیں۔ ورنہ دوسری صورت میں آپریشن کے ذریعے اسے بحال کرایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں غیرت کے نام پر قتل بھی عام ہیں۔ مرد رشتے دار عورت کے کسی مرد کے ساتھ تعلقات کے شبہے پر اسے قتل کر دیتا ہے۔ ایسے مجرموں کے ساتھ سماج، ریاست اور عدلیہ رعایت اور نرمی کے ساتھ پیش آتی ہے۔ اس طرح کے جرائم ہمارے ہاں قبائلی اور دیہاتی ماحول میں زیادہ ہوتے ہیں۔

انھی غیر سائنسی تصورات کے جلو میں لڑکی کے لیے پہلا حیض صدمہ انگیز تجربہ ہوتا ہے۔ چونکہ لڑکیوں کو کہا جاتا ہے کہ پردۂ بکارت پھٹنے سے لہو بہتا ہے، وہ بے چاری پہلے حیض کو اپنے کنوارپن کے چلے جانے پر محمول کرتی ہے۔ جنسی تعلیم کے فقدان کی وجہ سے اسے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہوتا۔ اکثریت کے ذہنوں میں بہت سے ایسے سوالات ہوتے ہیں جن کے سائنسی جواب ان کے پاس نہیں ہوتے۔ ماؤں کے ذہنوں میں بھی اور ہی طرح کے خوف پل رہے ہوتے ہیں۔ حیض پر ان کا پہلا سوال ہوتا ہے: ''کوئی مرد تو تمھارے پاس نہیں آیا؟'' یا ''تم کہیں گریں تو نہیں؟'' اس طرح کی یقین دہانی کے بعد وہ بیٹی کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کرتی ہے۔

یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ لڑکیاں پڑھنا چاہتی ہیں، لیکن باپ بھائی انھیں پڑھانے کے حق میں نہیں ہوتے، تاکہ وہ اپنے قریب رکھ کر اس کو کنٹرول کر سکیں۔ تعلیم کے لیے انھیں چار دیواری سے باہر جانا ہوگا۔ اسی لیے لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی ناخواندگی کی شرح کئی گنا زیادہ ہے۔ لڑکیوں کے تعلیمی مضامین کا فیصلہ بھی ماں باپ کرتے ہیں۔ اس میں بھی ''عزت'' کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ لڑکوں کے لیے دیکھا

جاتا ہے کہ کون سی جاب ''باعزت'' ہے۔ انھیں انجینئر نہیں بننے دیا جاتا، قانون اور صحافت کے شعبے میں بھی عام طور پر نہیں جانے دیا جاتا۔ لڑکیوں کی سرگرمیوں کو مسلسل محدود رکھنے سے ان کے اندر باہر خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ گھر سے باہر خود کو بے چین (uncomfortable) محسوس کرنے لگ جاتی ہیں۔ باہر انھیں اس طرح محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہو۔ عورت پر ایک اور بڑا خوف یہ ہوتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ آپ کو دوسرے لوگ جج کر رہے ہیں— اور انھیں ایسا کرنے کا اختیار ہے۔ لڑکی عزت ہے، لہٰذا اس کی قریب سے نگرانی اور اس پر نگاہیں رکھنا سماج کی ذمے داری ہے۔ اسے کنٹرول کرنا ہے، جیسے جانوروں اور دیگر پراپرٹی کو کیا جاتا ہے۔ جب کہ لڑکا ہونے کی صورت میں کسی ایسی ذمے داری کی ضرورت نہیں۔ لڑکے لڑکی کا فرق پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ شادی کے وقت دعا: ''تم خوش رہو، اللہ تمھیں بیٹا دے۔'' عورت حاملہ ہوتی ہے تو لڑکے کی اُمید لگائی جاتی ہے۔ لڑکی پیدا ہوگئی تو اس پر سب افسوس کا اظہار کرتے ہیں، اور ماں کو تسلیاں دینی شروع کر دی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو صرف لڑکیاں پیدا ہونے پر طلاق دے دی جاتی ہے۔ بیوی کا جینا حرام کر دیا جاتا ہے۔ بچی پیدا ہونے پر ماں پریشان ہو جاتی ہے۔ خود کو غیر محفوظ (insecure) سمجھنے لگتی ہے۔ اس کے میکے کے رشتے دار پریشان ہو جاتے ہیں کہ کہیں ان کی بیٹی کو طلاق نہ ہو جائے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ جونہی زچہ کو نرس یا ڈاکٹر نے بتایا کہ ''ایک خوبصورت بچی پیدا ہوئی ہے،'' ماں صدمے سے بے ہوش ہوگئی۔ ہمارے معاشرے میں غربت اور کثیر آبادی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ایسے بے شمار گھرانے ہیں جو صرف بیٹے کی اُمید پر لڑکیوں کا ڈھیر لگا لیتے ہیں۔ اور اگر بیٹا ہو بھی جائے تو پھر بھی اس کی جوڑی بنائی جاتی ہے، اس سے قطع نظر کہ اس طرح بچوں میں اضافہ کر کے وہ غربت کی دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ یہ سب اس پسماندہ کلچر کے مسائل ہیں جو ہمارے ملک میں رائج ہے، اور اسے توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے نہ اجازت دی جاتی ہے۔

پدرسری نظام میں مردوں کو سخت جان، آزاد، خودمختار اور صاحبِ عقل سمجھا جاتا ہے، جب کہ عورتوں کو جذباتی، تسلیم خو اور اطاعت پر مائل ہو جانے والا۔ بچی کو خاندان کے سب افراد فرمانبرداری، دستبرداری اور قبول کر لینے کی عادت اپنانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور انکار پر سزا دی جاتی ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ نافرمانی عیب ہے، شرمناک بات ہے۔ لیکن یہ اصول لڑکوں پر لاگو نہیں ہوتا۔ لڑکے اور لڑکی کے بیچ میں اہلِ خاندان کے رویے میں فرق ہی دونوں کی شخصیت کی تعمیر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ دونوں کو مختلف رول ادا کرنے کے لیے باقاعدہ condition کیا جاتا ہے اور ان سے مختلف توقعات باندھی جاتی ہیں۔ لڑکوں کو کہا جاتا ہے کہ انھیں مضبوط بننا چاہیے، جب کہ لڑکی کو نرم خو ہونے کو کہا جاتا ہے۔ انھیں خوفزدہ کیا جاتا ہے، ان کی جسمانی کمزوری کا انھیں احساس دلایا جاتا ہے، انھیں ضد اور تقاضا کرنے سے منع کیا جاتا ہے۔ لڑکوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ باہر کھیلنے جائیں، درختوں پر چڑھیں اور سیکھیں کہ خود کا دفاع کس طرح کرنا ہے۔ اور لڑکیوں کی تربیت بالکل اس سے مختلف کی جاتی ہے۔ انھیں بچپن سے ہی اپنے رشتے دار ہم عمر لڑکوں کے ساتھ مل جل کر کھیلنے سے منع کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ''اچھی لڑکیاں گھر میں ہی ٹھہرتی ہیں۔'' انھیں دوستوں کے گھر نہیں جانے دیا جاتا، کہ اس کا سامنا اس کی دوست کے بھائیوں سے ہو سکتا ہے، جو شرمناک بات ہے۔ یہ خوف اس حد تک چلا جاتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ان لڑکیوں کی کمی نہیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ لڑکوں کے پاس بیٹھنے سے ہی وہ حاملہ ہو سکتی ہیں! حتیٰ کہ وہ بھائیوں سے بھی دور ہو کر بیٹھتی ہیں۔ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ شرمیلی اور چھوئی موئی بن کر پیش ہوں۔ لڑکی کے رونے پر اسے خاموش ہو جانے کو کہا جاتا ہے جب کہ لڑکے کو رونے پر طعنہ دیا جاتا ہے۔ انھیں رونا نہیں چلّانا سکھایا جاتا ہے۔ عورتوں کے زیادہ رونے کی وجہ بھی یہ ہے کہ فیصلے اور منانے کی ہر صلاحیت سے تہی ہونے کے بعد رونا ہی ان کو اپنا ہتھیار دکھائی دیتا ہے۔ عورتوں کو ہمارے معاشرے میں یہ کہہ کر صاحبِ اختیار (decision making) عہدہ دینے سے گریز کیا جاتا ہے کہ وہ جذباتی ہونے پر مائل ہوتی ہیں، لیکن بعد میں انھیں جذباتی ہونے کی سزا بھی دی جاتی ہے۔

اگرچہ تعلیم اور معاشی خوشحالی سے اعتدال پسندانہ رویے پیدا ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی درمیانہ طبقے میں اس بات کی یقین دہانی رکھی جاتی ہے کہ عورتیں روایتی سماجی اقدار کے ساتھ مضبوطی سے چمٹی رہیں۔ انھیں خود سے سوچنے کی آزادی نہیں دی جاتی۔ ان سے جذباتی ردعمل کی ہی توقع کی جاتی ہے تاکہ اہم فیصلے گھر کے مرد حضرات ہی کر سکیں۔ عورتیں اگر جذبات سے جلد مغلوب ہو جاتی ہیں تو اس کی وجہ سماج میں انھیں

دی ہوئی نہایت محدود جگہ (limited social space) ہے۔ پہلے انھیں ''عورت''، ''صنفِ نازک'' اور ''جذباتی'' بنایا جاتا ہے، ان سے معاشرے کے طے شدہ نسوانی امیج کی اُمید کی جاتی ہے، اور پھر انھیں جذباتی اور نسوانی کہہ کر روزمرہ زندگی کے بارے میں فیصلے کے اختیار سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اگر عقل استعمال کرنے کی اجازت ہی نہ دی جائے گی تو فطری طور پر جذبات کا استعمال زیادہ ہو جائے گا۔ عورت کو ایک خودمختار فرد (person) بننے کی اجازت نہیں؛ وہ صرف کسی کی بہن یا بیٹی، بیوی یا ماں ہو کر رہ سکتی ہے۔ بچپن میں ان کی پرورش اس طرح کی جاتی ہے کہ اپنے ہر کام کے لیے فیملی کی دست نگر رہتی ہے، اور شادی کے بعد خاوند کی۔ ہر عورت کو اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی یہ خیال ضرور آتا ہے کہ کاش وہ لڑکا ہوتی تو بہتر پوزیشن میں ہوتی۔ سوسائٹی، عورت ہوتے ہوئے، اسے شخصیت کا مالک نہیں بننے دیتی۔ تعلیم یافتہ اور کمانے والی عورت کو بھی بالآخر اپنے خاوند کی خواہشات کے مطابق ڈھل جانا پڑتا ہے، ورنہ ان کی فیملی لائف بڑے تناؤ کے ماحول سے دوچار ہو جاتی ہے۔

ایک سروے کے دوران جب عورتوں سے پوچھا گیا کہ اگر انھیں دوبارہ موقع اور اختیار ملے کہ وہ اپنے خاوند کو منتخب کر سکیں، تو کیا اسی آدمی اور اسی طرح کی زندگی کو چنیں گی؟ حیرانی کی بات ہے کہ بیشتر عورتوں کا جواب اثبات میں تھا۔ وجہ یہ کہ عورت کے لیے یہ عزت کی بات نہیں کہ وہ اپنے خاوند کے علاوہ کسی اور شخص کے بارے میں سوچ بھی سکے۔ وہ سمجھتی ہے کہ وہ صرف ایک مرد کے لیے پیدا کی گئی ہے، تصور میں بھی کسی دوسرے کے بارے میں سوچنا حرام اور شرمناک ہے۔ اسے جیسا بھی خاوند مل جائے، وہ اپنے مقدر پر قانع ہوتی ہیں کہ یہی مرد ان کی قسمت میں لکھا گیا تھا۔ عورت کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ جس کسی کے ساتھ بھی وہ بیاہ دی گئی ہے، اپنی شادی کو ہر حالت میں نبھائے رکھے، خواہ ہمیشہ کے لیے ناخوش زندگی ہی کیوں نہ گزارنی پڑے۔ لڑکیوں کو بچپن سے اس طرح پالا جاتا ہے کہ وہ اپنے ذہن میں ایک تصوراتی اور جذباتی دنیا بسا لیتی ہیں۔ انھیں ایک ایسے آدمی کے ملنے کی اُمید رہتی ہے جو آنکھیں بچھائے رکھے گا، اور ہمیشہ پیار اور مشفق رویے سے پیش آئے گا۔ لیکن عورت کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی۔ ہمارے سماج کے مرد اپنی بیوی کی ضروریات کو نہیں سمجھ سکتے، اس لیے کہ سوسائٹی نے ایسا کرنا سکھایا ہی نہیں ہوتا۔ طلاق کو عورت ازدواجی مسائل کا حل نہیں سمجھتی۔ آزاد اور خودمختار حیثیت کے بغیر طلاق اس کے مسائل میں کمی نہیں کر سکتی، چنانچہ صبر اور قربانی کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ اسے پتا ہے کہ طلاق کی صورت میں عورت خاندان کے لیے ساری زندگی کا بوجھ اور ذمہ داری بن جائے گی۔

ہمارے ہاں کی بچیاں ماں باپ کے سخت کنٹرول میں پلتی ہیں۔ غریب اور مڈل کلاس کی مائیں خود بھی کمزور، بے حوصلہ اور قنوطی ہوتی ہیں، چنانچہ بچیوں کے لیے بھی وہ اسی طرح کا رول ماڈل (role model) بنتی ہیں۔ ماں کو بچی کی ذات کم اور خاندان کی عزت زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ چونکہ ان لڑکیوں نے ماں کو مکمل اطاعت گزار (submissive) دیکھا ہوتا ہے، لہٰذا ان کے سامنے کسی مضبوط عورت کی کوئی مثال ہی نہیں ہوتی جس کی بنیاد پر وہ اپنا رویہ تشکیل دے سکیں۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ ہماری لڑکیاں اگرچہ ماؤں کے سخت رویے پر شکوہ کرتی ہیں، لیکن آخرکار انھیں ہی سچا سمجھتی ہیں اور شادی کے بعد انھی کی مثال پر چلنا شروع کر دیتی ہیں۔ وہ جانتی ہے جتنا وہ سماج اور ماحول کے سامنے سر جھکائے رکھے گی معاشرہ اتنا ہی اچھا سمجھے گا، لہٰذا عورت کے اندر مفعولیت اور اپنی خواہشوں کو مارنے کا رجحان جنم لے لیتا ہے۔ اس کے کھانے پینے اور لباس وغیرہ سے لے کر تعلیم اور شادی تک کے سب فیصلے خاندان والے کرتے ہیں۔ وہ تسلیم خو رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتی ہے، بلکہ اسے اپنے مفاد میں موڑ دینے کا ذریعہ بنا لیتی ہے۔ ایک ورکنگ عورت کی بہ نسبت گھریلو عورت خود کو زیادہ آرام دہ محسوس کرتی ہے، کہ بیرونی دنیا کی جدوجہد سے اس کی جان چھوٹی ہوئی ہے۔

ہماری عورتوں کی اکثریت کو ''آزادیِ نسواں'' یا عورتوں کے حقوق کی کسی تحریک کا کچھ علم نہیں۔ سماج، سرکار، میڈیا اور ملاؤں نے ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا رکھی ہے کہ ''ہمارے مذہب نے ہمیں وہ تمام حقوق دے رکھے ہیں جن کی ہم کو ضرورت ہے، لہٰذا ہمیں کسی آزادی کی تحریک کی ضرورت نہیں۔'' انھیں بتایا جاتا ہے کہ آزادی کرپشن کی طرف لے جاتی ہے۔ ان سب ''مشرقی'' عورتوں کو یقین ہے کہ آزادی

کے لحاظ سے مغرب کی عورت آئیڈیل نہیں ہے۔ ہمیں مردوں کے برابر حقوق کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہماری عورتوں کے ذہن میں شرم اور عزت کے تصورات اتنے گہرے بیٹھے ہیں کہ وہ آزادی اور کرپشن کو ایک ہی چیز سمجھتی ہیں۔ ہماری عورت کو صدیوں سے مرد کنٹرول کر رہے ہیں۔ انھیں سماج سے الگ اور گھر کی چار دیواری میں محدور رکھا جاتا ہے۔ انھیں ذہنی اور جسمانی لحاظ سے مردوں سے کمزور کہا جاتا ہے۔ اس کا کام اطاعت کرنا، مان لینا اور سپرد کر دینا ہے۔ اسے سکھلایا جاتا ہے کہ اس نے دوسروں کی خدمت کرنی ہے۔ اس کی ماں اس کی آئیڈیل ہوتی ہے۔ لڑکی گھر کی عزت ہے، اس کی حفاظت کرنی ہے۔ اسے کنوارا اور خالص رکھنا ہے، ایک ایسے مرد کے لیے جو مستقبل میں اس کا شوہر ہوگا۔ شادی دو مساوی پارٹنرز کا بندھن نہیں؛ اس میں ایک فریق طاقت ور ہے اور دوسرا کمزور۔ شادی بذاتِ خود عورت کو کنٹرول کرنے کے ادارے کا کام کرتی ہے جس کا مطلب فیملی کے فریم ورک میں عورت کو مطیع بنانا ہے، اسی لیے شادی کو نہایت مقدس بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ محبت (love) جیسے حسین اور باہمی پیار سے لبریز جذبے کا مطلب شرعی اصطلاح میں یہ رہ جاتا ہے کہ بیوی ایک کٹھور قسم کے (اجنبی مرد) خاوند کی دن رات خدمت اور فرمانبرداری کرے، جس کی اس کے علاوہ اور بھی بیویاں ہوسکتی ہیں۔ یہ لطافت کی موت نہیں تو کیا ہے؟ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ہماری سوسائٹی عورت کو احترام اور طاقت اس وقت دیتی ہے جب وہ جنسی لحاظ سے بے کار ہو جاتی ہے۔ یعنی بوڑھی عورتوں (ساس، ماں، دادی، نانی) کو احترام اور طاقت کا حقدار سمجھا جاتا ہے! عورت کو میک اَپ اور فیشن میں بھی مبتلا اس لیے کیا جاتا ہے کہ ان کا دماغ وقت اور پیسہ یونہی مصروف رہے۔ آج کل لڑکیوں کو تعلیم اس لیے نہیں دی جاتی کہ وہ سماج میں کوئی مفید کردار ادا کریں، بلکہ اس کی مارکیٹ ویلیو بڑھانے کے لیے دی جاتی ہے، تاکہ شادی کا امکانات بہتر بنائے جاسکیں۔ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے بعد بھی خاندان کی شرم اور عزت کے چکر سے جڑی رہتی ہیں، لہٰذا معاشرے کے لیے کوئی تعمیری کردار ادا کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔ عورت کا پہلا کام ''بیوی'' بننا ہے؛ کمائی والا کام عورت کی دوسرے درجے کی ترجیح ہے۔ اسے ایسی پیشہ ورانہ تعلیم دینے سے گریز کیا جاتا ہے جس سے وہ خود مختار ہو جائے۔ ملازمت کرنے والی عورت پر دوہرا دباؤ آجاتا ہے — اس نے باہر بھی کام کرنا ہے اور گھر اور بچوں کو بھی سنبھالنا ہے۔

ماں باپ کو راحت بچی کی شادی کے موقعے پر ملتی ہے، جب بیٹی کی حفاظت سے ان کی جان چھوٹتی ہے۔ شادی کے بعد لڑکیوں پر پابندیاں نرم ہو جاتی ہیں اور سماجی تعلقات میں اسے ذرا کھلے پن کی اجازت ملتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی شادیوں اور ہمارے ہاں کی شادیوں میں بہت فرق ہے۔ وہاں جوڑا شادی سے قبل کئی مراحل سے گزرتا ہے۔ کہیں ملاقات ہوتی ہے، آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں، دوستی ہوتی ہے پھر dating اور کورٹ شپ کے بعد کہیں جا کر منگنی اور شادی کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں شادی کوئی پراسس نہیں ہوتا۔ دونوں کے لیے سیدھی ہی سہاگ رات آجاتی ہے۔ عموماً ایک دوسرے کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی! یہاں شادی دو افراد کے درمیان نہیں، دو خاندانوں کے بیچ ہوتی ہے۔ لڑکے والوں کی طرف سے جب رشتہ آتا ہے تو فوراً ہاں نہیں کر دی جاتی۔ اس میں بھی عزت کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اگر جلدی سے ہاں کر دی تو لڑکے والے یہ نہ سمجھ لیں کہ لڑکی میں کوئی نقص ہے، یا ماں باپ اس سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ لڑکی والے خود لڑکے والوں سے رشتہ نہیں مانگ سکتے۔ لڑکی کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے رشتے کے مانگے جانے کا انتظار کرے۔ عام طور پر منگنی کے بعد بھی دونوں کو ملنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

''محبت'' شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ یہ لفظ شادی سے پہلے ممنوع ہے۔ لڑکی کو کسی لڑکے سے محبت ہو جائے تو یہ شرمناک بات ہے۔ اور اگر لڑکے کو ہو جائے تب بھی والدین وہاں اس کی شادی کی منظوری نہیں دیتے۔ لڑکیاں بھی محبت کی شادی کو خاندان کی ترتیب شدہ شادی سے زیادہ خوش کن نہیں سمجھتیں، کیونکہ محبت کو عورت کی بے عزتی سے جوڑا ہوا ہے۔ عورت سمجھتی ہے کہ ایک تو محبت سے وہ بدنام ہوگی، اور دوسرے مرد بھی اسے استعمال کرنے کے بعد کسی اور لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ ادھر مرد بھی سمجھتے ہیں کہ جو لڑکی محبت کرتی ہے وہ اچھی نہیں ہے، اور اگر مجھ سے محبت کرتی ہے تو کسی دوسرے سے بھی کر سکتی ہے۔ دونوں طرف شک کا عنصر قائم رہتا ہے۔ جب کہ روایتی شادی میں ذمے داری خاندان کی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ نتائج کو بھی برداشت کرتے ہیں۔ چنانچہ عورتیں محبت کی شادی سے خوف زدہ رہتی ہیں۔ عورتیں مردوں کے چہرے سے ڈرتی ہیں۔ بظاہر وہ بڑے مہربان، محبت کرنے والے اور افہام و تفہیم کے مالک نظر آتے ہیں لیکن ناقابلِ بھروسہ

ہوتے ہیں۔اعلیٰ تعلیمی اداروں میں لڑکوں اور لڑکیوں میں محبت کا امکان ہوسکتا ہے۔لیکن وہاں بھی شادی نہیں ہوتی۔ایک تو لڑکی گریجویشن کے بعد جب گھر جاتی ہے تو خاندانی دباؤ سے وہ ان کا تجویز کردہ رشتہ قبول کر لیتی ہے۔دوسرے تازہ تازہ تعلیم مکمل ہونے کی وجہ سے لڑکا شادی کا خرچہ بھی برداشت نہیں کرسکتا۔عورت کے ذہن میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جتنی جلدی پہلی آنے والی آفر کو قبول کرلے اتنا ہی بہتر ہے۔عمر ذرا بڑی ہوگئی تو کسی بہتر آفر کے چانس کم ہو جائیں گے۔ پڑھی لکھی اور ملازمت پیشہ خواتین زیادہ عمر میں شادی کرتی ہیں، بلکہ ان کی ایک اچھی خاصی تعداد بغیر شادی کے رہ جاتی ہے۔خاتونِ خانہ کی زندگی گزارنے والی عورتوں کی شادیاں کم سنی میں بھی ہوسکتی ہیں۔لڑکیوں کا ذہن عام طور پر اس طرح کا بنایا جاتا ہے کہ وہ شادی کو خوشیوں کے حصول کا ذریعہ سمجھتی ہیں، جبکہ آس پاس کی ناخوش شادیوں کو استثنائی قرار دے کر نظر انداز کر دیتی ہیں۔چنانچہ لڑکیاں آئیڈیل کے حصول کی جدوجہد میں رہتی ہیں۔حقائق اس سے برعکس نکلتے ہیں۔اور جب انھیں آئیڈیل نہیں ملتا، وہ خود کو گناہ گار اور ناخوش محسوس کرنے لگتی ہیں۔عورت پر سوشل کنٹرول کچھ اس طرح کا ہے کہ وہ فیملی کے بغیر نہیں رہ سکتی، لہٰذا اسے کسی بھی رشتے دار مرد کے رحم وکرم پر رہنا ہوتا ہے۔چنانچہ نچلے طبقے کی عورت سمجھتی ہے کہ اپنے خاندان کے افراد کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے ایک خاوند کے ہاتھ ذلیل ہونا بہتر ہے، کیونکہ اپنے گھر میں اس پر حکم چلانے والے بہت سے ہوتے ہیں۔لہٰذا شادی ماں باپ کے ناجائز دباؤ اور گھٹن کے ماحول سے نجات کا بھی ذریعہ ہوتی ہے۔

اس معاشرے میں میاں بیوی کی جنسی زندگی کیسی ہوتی ہے؟ جب یہ سوال ایک عورت سے پوچھا گیا تو اس کا جواب تھا: ''میرے خاوند کے لیے سب سے اہم چیز سیکس اور کھانا ہے۔'' بیوی کے ساتھ افہام وتفہیم کی کوئی ضرورت نہیں۔ بیوی کے ساتھ میٹھے بول سے پیش آنا ضروری نہیں۔معمولی بات پر وہ چلاّ سکتا ہے، طلاق کی دھمکی دے سکتا ہے۔جب سونے کے کمرے میں جائے، عورت کو بھی تیار رہنا ہوتا ہے۔نہ بلانے پر جا کر پوچھنا پڑتا ہے۔ہاں بھی کرسکتا ہے اور تھکا ہوا کہہ کر انکار بھی کرسکتا ہے— سب اس کی مرضی پر منحصر ہے۔اگر عورت کسی وجہ سے تیار نہ ہو تو خاوند کی نافرمانی میں خدا، مقدس روحیں اور فرشتے سبھی ناراض ہو جاتے ہیں! سوشل سسٹم خاوند سے توقع رکھتا ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ محبت کی بجائے آمرانہ طریقے سے پیش آئے، ورنہ لوگ جورو کا غلام کہنا شروع کر دیتے ہیں۔اگر انھیں اپنی بیوی کا خیال بھی ہو تب بھی سماجی نظام انھیں اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس کا اظہار کریں، لہٰذا بیویاں اپنے خاوند کے احساسات سے غافل رہتی ہیں۔جنسی تشفی کو صرف مرد کی ضرورت سمجھا جاتا ہے جب کہ عورت نے ''خدمت گار'' کی حیثیت سے خاوند کی جنسی ضرورت بھی اسی طرح پوری کرنی ہوتی ہے جس طرح وہ اس کی دیگر ضروریات کو پورا کرتی ہے۔جیسے کھانا پیش کرتی ہے، استری شدہ کپڑے دیتی ہے، اسی طرح اس کی جنسی تسکین بھی پوری کرے۔یقین کیا جاتا ہے کہ جنسی لحاظ سے عورت کی فطرت وصول کرنے والے کی ہے اور وہ عام طور پر ٹھنڈی (frigid) ہوتی ہے، جب کہ مرد کی جنسی خواہش شدید ہوتی ہے اور وہی اس میں سرگرم ہونے کا حق رکھتا ہے۔عورت کی جنسی فعل میں جوابی شرکت کا مطلب اس کا ''چالو'' ہونا ہے اور اس پر بطور بیوی بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔

لڑکیوں کو کہا جاتا ہے کہ سیکس مردوں کا کام ہے۔''باعزت'' لڑکی ایسا کچھ نہیں کرتی جس سے کوئی مرد اسے چاہنے لگے۔ان کے اندر مرد اور جنس کا خوف بٹھایا جاتا ہے، اور انھوں نے ہر قیمت پر اپنے کنوارپن کی حفاظت کرنی ہوتی ہے۔انھیں سخت ورزش یا چھلانگیں لگانے سے روکا جاتا ہے۔ پردۂ بکارت کی حفاظت جسم کے دوسرے سب اعضا سے زیادہ اہم ہے۔جوان لڑکی کے جسم اور ذہن دونوں کنوارے ہونے چاہیے۔زنا بالجبر کے قصوں سے انھیں دہشت زدہ کیا جاتا ہے اور اس طرح عورت کے مکمل استحصال کی راہ ہموار کی جاتی ہے۔عورت کے ہاتھ کے ساتھ کسی مرد کا ہاتھ بھی چھو جائے تو اُسے ایسا لگتا ہے کہ کوئی جرم ہو گیا ہو۔جب کہ مرد یا نوجوان لڑکے جنسی تجربے کا کوئی نہ کوئی رستہ نکال لیتے ہیں جسے سوسائٹی نظر انداز کیے رکھتی ہے، بلکہ اسے شادی کے لیے فائدہ مند سمجھا جاتا ہے۔دوسری طرف چونکہ عورت کو ہمیشہ سے جنس سے خوفزدہ رکھا گیا ہوتا ہے، لہٰذا ہنی مون مرد کے لیے تو قابلِ لذت ہوتا ہے، عورت کے لیے نہیں۔عورت کے لیے شادی کی پہلی رات خوف ودہشت کی رات ہوتی ہے، کیونکہ مرد نے بھوکے بھیڑیے کی طرح عورت پر حملہ آور ہونا ہوتا ہے— اور پھر یہ تشویش کہ وہ اس کے معیارِ عصمت پر پوری اُترتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ ان پاک باز معاشروں میں شادی کی پہلی رات کسی ''ریپ'' سے کم نہیں ہوتی۔شادی سے قبل دونوں کو سیکس کا نہایت ہی محدود علم ہوتا ہے۔دونوں اپنی جنسی صلاحیت کے بارے میں خوف زدہ ہوتے ہیں۔عورتوں کو female

orgasm کا نہیں ہوتا اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں کہ جنسی تسلی (fulfilment) ان کی بھی ضرورت ہے۔ اسی طرح مردوں کو بھی عورت کے جنسی میکانزم کا علم نہیں ہوتا، نہ ہی اپنے ساتھی کو شریک اور تیار کرنے کا۔ ہماری عورت کو اس سے فرسٹریشن ہوتی ہے، لیکن اسے مانتی نہیں اور نہ اس کا اظہار کرتی ہے۔ چنانچہ ہمارے معاشرے میں جنسی فعل میاں بیوی میں سے کسی کے لیے بھی حقیقی طمانیت کا باعث نہیں بنتا۔ ان کا ازدواجی رشتہ جنسی ملاپ اور بچے پیدا کرنے تک ہی محدود رہ جاتا ہے، وہ مکمل جسمانی ملاپ کے تجربے سے لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔ اگرچہ مردوں کو عورت (بیوی) سے اونچی جنسی توقعات ہوتی ہیں کہ وہ میک اَپ کرے، سیکسی لباس زیب تن کرے، لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرتے۔ جنسی فعل کو خوبصورت اور پُرلطف بنانے میں مرد کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں لیتے، اس لیے کہ انھیں اپنی ''عزت اور وقار'' بلند رکھنا ہوتا ہے! بیوی کو ویسے تو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا، اور اگر عورت ایسا کرے تب بھی مرد بُرا مناجاتے ہیں۔ وہ بھی جنسی فعل کو بے جھجک نہیں کرنا چاہتے کہ عورت ''خراب'' ہی نہ ہو جائے۔ اور دوسرے بیوی اپنی ''ملکیت'' میں ہوتی ہے، اسے for granted بھی لیا جاتا ہے۔ رومانس اور محبت کا ویسے ہی کوئی تصور نہیں، بلکہ شادی کا مطلب رومانس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ چنانچہ میاں بیوی کے ادھورے رشتے کی وجہ سے مردوں کی اکثریت شادی کے بعد بھی دوسری عورتوں میں دلچسپی لینا نہیں چھوڑتی۔

عورت کو سکھلایا جاتا ہے کہ اس نے سونے کے کمرے میں اپنے خاوند کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا ہے، اس کی جنسی طلب کو پورا کرنا ہے، کیونکہ یہ اس کی خدا کی طرف سے مقرر کردہ مقدس ''ڈیوٹی'' ہے۔ یہ اس کے وقار کے خلاف ہے کہ وہ خاوند سے محبت کی طلب گار ہو۔ شادی کا مطلب مذہب کی منظور شدہ جنسیت ہے نہ کہ دو محبت کرنے والوں کا ملاپ۔ اسی طرح مرد کو بھی یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ عورت پر غالب ہے۔ لڑکیوں کو بچپن سے سکھلایا جاتا ہے کہ مردوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، لہٰذا بیوی کی ڈیوٹی ہے کہ وہ خاوند کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور اسے ''خوش'' رکھے، خاص طور سے بستر پر، تاکہ بیوی کو ضمانت مل جائے کہ خاوند اس کے ساتھ وفادار رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ خاوند کے بُرے سلوک کے باوجود بیویاں بستر پر مرد کے پاس چلی جاتی ہیں۔ اور اس میں ان کے اس گہرے ایمان کا حصہ ہوتا ہے کہ خدا نے عورت کو مرد کے خدمتگار کے طور پر پیدا کیا ہے، اور اگر وہ اس کے منافی حرکت کرتی ہے تو خاوند کا اس پر تشدد جائز ہوگا۔ بیوی کا فرض ہے کہ وہ کسی بات پر نہ اعتراض کرے اور نہ شکایت۔ اگر عام عورت سے پوچھا جائے کہ کیا سیکس اس کے لیے بھی اہم ہے، تو اس کا جواب ہوگا نہیں۔ عورتوں کی اکثریت سمجھ لیتی ہے کہ اس سلسلے میں وہ مردوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ جنس میں دلچسپی ان کا مسئلہ نہیں ہے۔

اس طرح کے معاشروں کا ادبی لٹریچر بھی غور طلب ہے۔ ان کے ہاں اکثر محبت کی لوک کہانیاں مشہور ہوتی ہیں۔ لیکن ان قصوں کا عاشق اپنی محبوبہ سے جنسی اختلاط نہیں کرتا، ان کی محبت ''پاک'' اور روحانی ہوتی ہے۔ ان کہانیوں میں عاشق اور محبوب کو شادی یا ملاپ سے روک دیا جاتا ہے، کیونکہ شادی کا مطلب عشق نہیں، عشق کا خاتمہ ہے! لیکن عملی طور پر سوسائٹی غیر جنسی (nonsexual) محبت کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ دو محبت کرنے والے شادی نہیں کر سکتے۔ جنرل ضیا کے اسلامی دور میں جب دو جوان لڑکی لڑکا گھر والوں کی مخالفت کی وجہ سے گھر سے بھاگ گئے تو عدالت نے ان کی شادی کی اجازت دینے کی بجائے انھیں کوڑے مارنے کی سزا دی تھی، حالانکہ وہ کرسچن مذہب سے تھے۔ ساری دنیا محبت کرنے والے دو دلوں کا احترام کرتی ہے، لیکن پاک سرزمین پر محبت گناہ ہے اور شادی کے لیے محبت کا ہونا اور بھی غلط ہے۔ ان کی شریعت میں شادی محبت نہیں، سیکس ہے۔ اس لیے جو عورت خاوند سے محبت کر سکتی ہے، وہ کسی اور سے بھی محبت کر سکتی ہے! اس کی حیثیت جنسی اور گھریلو خدمت گار کی ہے یا پھر اس سے وارث پیدا کرنے ہوتے ہیں۔ سچی محبت کا مطلب ہے، دونوں محبت کرنے والے مساوی ہو جائیں گے، عورت کی غلامانہ حیثیت نہیں رہے گی۔ اس طرح پاک باز معاشرے کا درجہ بندی پر مشتمل ڈھانچہ ٹوٹ سکتا ہے۔ محبت کے ناپسندیدہ ہونے میں دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ جب بھی عورت اور مرد کو کہیں ملنے کا موقع ملے گا وہ فوراً سیکس کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ لہٰذا ان میں دوستی اور محبت کے رشتے قائم ہی نہ ہونے دیے جائیں۔

محبت کے بارے میں انگریزی زبان کے love-making جیسے جملوں کے مترادف الفاظ ہماری زبانوں میں نہیں ہیں، اس لیے کہ

یہاں کے جوڑوں (couples) کے بیچ محبت کا کبھی وجود نہیں رہا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے ہاں کے میاں بیوی میں محبت ہوتی ہی نہیں۔ ان کے درمیان بھی محبت ہوسکتی ہے، لیکن اس کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ یہاں محبت بڑی پرائیویٹ قسم کی ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو اپنی محبت دکھاتے نہیں ہیں۔ اگر کوئی مرد اپنی بیوی سے اظہار محبت کرے گا تو اسے اس کی کمزوری اور بے عزتی پر محمول کیا جائے گا۔ اور جب وہ دونوں خلوت میں ہوں گے، تب بھی محبت کو اظہار سے روکا جاتا ہے، کہ ان کی تربیت ہی ایسی ہوئی ہوتی ہے۔ انھوں نے محبت کرنے والے کبھی دیکھے ہی نہیں ہوتے۔ خاوند سمجھتے ہیں اس سے بیوی خراب ہوجائے گی، فائدہ اٹھانا شروع کردے گی، اور اس کے تقاضے بڑھ جائیں گے۔ اس سوسائٹی میں یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ غصے کا اظہار تو کرسکتے ہیں، محبت کا نہیں۔ غصہ کرنا مردانگی ہے۔ ہمارے کلچر میں عورتیں غصے کا اظہار شکایت کرکے یا پھر رو کر کرتی ہیں، جب کہ مرد چلا کر اور مشتعل ہوکر — یوں اپنی بیوی پر اس کنٹرول کا اظہار کرتے ہیں، جو انھیں حاصل ہے۔ مردوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو اور سرد مہری کا رویہ رکھے۔ بیوی کبھی کوئی شرارت یا مذاق کر بیٹھے یا سیکس کی بات کردے تو اسے کہا جائے، ''ہم بچے نہیں ہیں۔'' حتیٰ کہ باپ بیٹی سے جتنا اظہارِ محبت کرسکتا ہے خاوند اتنا بیوی سے نہیں۔ باپ بیٹی کو گلے لگا سکتا ہے، چوم سکتا ہے، لیکن خاوند اپنی بیوی کو نہیں۔

ہماری سوسائٹی کی شادیوں میں میاں بیوی کے درمیان رفاقت اور دوستی (companionship) کا کوئی تصور نہیں۔ یہاں نہ دونوں کے تعلقات میں مساوات ہے اور نہ خاوند دوست بنتا ہے۔ وہ گھر کا حاکم ہے۔ میاں بیوی کے درمیان پیار کی زبان کا کوئی رواج نہیں ہوتا۔ یہاں آپس میں ''شکریہ'' اور ''مہربانی'' کی کوئی گنجائش نہیں۔ بیوی آسانی کے ساتھ خاوند سے ایسی بات نہیں کرسکتی جو اسے پریشان کرتی ہو۔ ہمارے ہاں بیٹیوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اپنے خاوند کے ساتھ اپنے خاندان کی بات احتیاط برت کر کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اسے بعد میں بیوی کے خلاف استعمال کرے۔ اس سوسائٹی میں میاں بیوی کے رشتے سے بہن بھائی کا اور ماں بیٹے کا رشتہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

ہماری عورت کے لیے تفریح کا نہ کوئی بندوبست ہے اور نہ کوئی وقت۔ مغرب کی عورت کے پاس فارغ وقت گزارنے کا اپنا شیڈول ہوتا ہے۔ اس نے سوئمنگ یا سپورٹس وغیرہ میں لازماً شریک ہونا ہوتا ہے، جب کہ ہماری عورتوں کے پاس کہیں اور دل لگانے کو کچھ نہیں ہوتا۔ ان کا اپنا (independent) شیڈول کوئی نہیں ہوتا، اس لیے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے خاوند اپنے دوستوں میں وقت گزارنے کی بجائے جلد از جلد گھر آئیں اور انھیں کوئی کمپنی مل سکے۔

عورت کی آزادی کے لیے کیا کرنا ہوگا؟

1- عورتوں کا شعور بڑھانا ہوگا

2- ان کی سوچ کے انداز کو بدلنا ہوگا

3- مرد اور عورت کے درمیان تفریق کو کم کرنا ہوگا۔

سائنسی انقلاب اور کہنہ جنسی نظریات کا خاتمہ

جدید سائنس سے قبل مذہبی عقائد کا دور تھا۔ جس بات کو جاننا انسان کے لیے ناممکن تھا اس کے لیے انسانی ذہن نے ایک آسان راستہ تلاش کیا— وہ کام ماورائی طاقت کے سپرد کر دیتا تا کہ منطقی ذہن کو گنجلک سوالوں سے بچایا جا سکے۔ پیدائش کا عمل ایک فطری مظہر تھا جو انسان کی سمجھ سے بالا تھا۔ اس سادہ لوح زمانے میں بھی ذہن اس طرح کے سوال کرنے سے باز نہیں آتا تھا کہ ہم کہاں سے آئے؟ کس طرح پیدا ہوئے؟ کیوں پیدا ہوئے؟ بچے میں جنسی تفریق کیوں کر پیدا ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ انسان کے لیے یہ سوالات کس قدر اہم تھے، ہم اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگا سکتے ہیں کہ مذاہب نے خدا کے وجود کے لیے جس دلیل کو سب سے زیادہ استعمال کیا وہ پیدا کرنے اور مارنے کی صلاحیت ہے۔

ہماری حالیہ تاریخ تک جنس اور پیدائش سے متعلقہ سب پہلو بلا شرکت غیرے خدا کے قبضۂ قدرت میں تھے— بچہ پیدا ہونا ہے یا نہیں، کب ہونا ہے، صحت مند ہوگا یا معذور، لڑکی ہوگی یا لڑکا، شکل وصورت کس طرح کی ہونی ہے۔ خدا کی مرضی تھی کہ وہ کسی کو بانجھ کر دے یا زرخیز۔ ان چیزوں کے بارے میں انسان نہ تو کچھ کہہ سکتا تھا اور نہ ہی مداخلت کر سکتا تھا۔ یہ سب خدا کی منشا پر منحصر تھا۔ لیکن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پیدائش سے متعلق سب کام انسان کی اپنی دسترس میں آتے جا رہے ہیں اور ان سب کاموں کے بارے میں پیش گوئی کرنا یا اپنی مرضی کی مداخلت کرنا آج ہسپتالوں اور لیبارٹریوں میں معمول کی بات ہوگئی ہے۔

پرانے زمانے نے جنسی ضوابط اور اخلاقیات کی ساری عمارت اسی نظریے پر رکھی تھی کہ پیدائش کا عمل ایک اُلوہی فعل ہے۔ پیدائش اور جنسی اختلاط کے بارے میں تمام مذہبی نظریات اور احکامات جدید سائنس نے صرف مانعِ حمل ادویات ایجاد کر کے اُلٹ کر رکھ دیے۔ بچہ پیدا کرنا ہے یا نہیں، اس کا انحصار انسان کی مرضی پر ہو گیا ہے۔ یہ ایک بڑا انقلاب ہے اور قدیم فکری نظام کے لیے بہت بڑا دھکا۔ زنا کا سارا شرعی حساب کتاب محض عورت کے حاملہ ہو جانے کی دلیل پر تھا اور شرعی عدالتیں عورت کو محض اسی کمزوری کی بنیاد پر زنا کا مجرم ٹھہرا دیا کرتی تھیں اور مرد شک کی بنیاد پر شرکتِ زنا سے بری کر دیا جاتا تھا۔ گویا مانعِ حمل ادویات نے پدری اور فیوڈل سماج کے ظالمانہ اخلاقی شکنجے سے عورت کو آزاد کرنے سب سے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ جنس سے متعلق قدیم قوانین اور اخلاقی ضوابط مانعِ حمل ادویات کے آنے سے اپنی موت آپ مر چکے ہیں۔ مرد وزن کا مباشرت کی طرف راغب ہونا ایک جبلی عمل ہے اور اس کے نتیجے میں بچے کی پیدائش ایک فطری عمل ہے۔ ماضی میں بچے کی پیدائش کے ہونے یا نہ ہونے میں انسان کو کوئی دسترس حاصل نہ تھی۔ اور اس میں مرد کو فطرت کی طرف سے ایک فائدہ (advantage) حاصل تھا، وہ جبلی تقاضے سے فارغ ہوتے ہی اس کے فطری نتیجے کی ذمے داری لینے یا نہ لینے میں آزاد ہوتا تھا، جب کہ عورت پھنس جاتی تھی اور سماج کا اندھا انصاف عورت پر لاگو کر دیا جاتا تھا۔ سائنس کا عورت پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے مرد کا وہ فائدہ چھیننے میں مدد کی ہے جو فطرت نے اسے دے رکھا تھا۔ اب دونوں برابر کی سطح پر آ گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مانعِ حمل ادویات آنے کے بعد زنا اپنی کلاسیکل تعریف میں زنا ہی نہیں رہا ہے۔ اس کا سارا منظر نامہ ہی بدل گیا ہے۔ اب اپنے اور سوسائٹی کے لیے مسئلہ بنائے بغیر کوئی بھی مرد وزن اپنی باہمی مرضی سے جنسی فعل میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اگر سماج نے اس عمل کو ناجائز بھی قرار دے رکھا ہے تو عملی طور پر اس کا نفاذ اور ثبوت ہی مشکل ہو گیا ہے۔ یہاں مقصود زنا کی حمایت کرنا نہیں بلکہ مذہبی تصورات کی بنیاد پر قائم کردہ قدیم قوانین کے دیوالیہ ہو جانے اور اس کے نتیجے میں عورت کو جنسی استحصال سے جو نجات ملی ہے، ہم اس کی بات کر رہے ہیں۔ اب جدید دور کے تقاضوں کے مطابق نئے اخلاقی ضوابط بنانے کی ضرورت ہے۔ اب پرانا اخلاقی نظام مزید قائم رکھنا بے کار فعل ہے، اسے اپنی شکست مان لینی چاہیے۔

بچہ پیدا کیا جائے یا نہ کیا جائے، اس پر انسان اور بالخصوص عورت کی دسترس انسانی سماج میں ایک نیا تصور اور بڑا انقلاب ہے۔ اس پر

پرانے نظریات کی شکست وریخت یقینی ہے۔ کہا جاتا تھا کہ جن کو پیدا کرنا تھا، خدا نے ان کی روحیں پیدا کر رکھی ہیں، لیکن اب چونکہ انسان اپنی مرضی سے بچوں کی تعداد کم یا زیادہ کرسکتا ہے، تو پہلے سے روحیں پیدا کرنے کا تصور محل نظر ہوگیا ہے۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ قدرت کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق حیات پیدا ہونے کی جب بھی مادی صورتِ حال وقوع پذیر ہوتی ہے، بچہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اب انسانی آبادی کے اضافے میں انارکی کا خاتمہ ہوگیا ہے، انسان انفرادی اور قومی سطح پر اپنے وسائل کے مطابق آبادی کی منصوبہ بندی کرسکتا ہے اور جنسی عمل محض افزائشِ نسل کے لیے نہیں، بلکہ فریقِ ثانی کے لیے شدتِ محبت کے اظہار اور جبلی ونفسی تناؤ کے خاتمے کے لیے استعمال ہوسکتا ہے۔ اب یہ ممکن ہے کہ سوسائٹی اور اپنی ذات کے لیے مسئلہ پیدا کیے بغیر جنسی فعل میں شریک ہوا جاسکتا ہے۔ یہ بات غلط تھی کہ جنسی خواہش محض افزائشِ نسل کے لیے فطرت نے پیدا کر رکھی ہے۔ اگر یہ بات حقیقی ہوتی تو کم عمری میں ہی فطرت انسان کو جنسی فعل کے لیے تیار نہ کرتی، گیارہ بارہ سال کی بچی کو حیض نہ آتے، اور اسی عمر کے لڑکوں کو گیلے خوابوں سے واسطہ نہ پڑتا، نوزائیدہ بچے کو جنسی اعضا سے لذت نہ ملتی، اور عورت کو حاملہ ہونے کے بعد جنسی خواہش نہ ہوتی، جب کہ بسا اوقات حاملہ عورت کی جنسی خواہش معمول سے بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جنسی جبلّت کثیر المقاصد فعل ہے، اور ان مقاصد کو الگ الگ یا ایک ساتھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جنسی فعل گویا تین مقاصد کا مجموعہ ہے: اس سے افزائشِ نسل بھی کی جاسکتی ہے، یہ لذت حاصل کرنے اور جسمانی تناؤ کے خاتمے کا ذریعہ بھی ہے، اور یہ محبت کی انتہا کا بھی نام ہے، جس میں دو مخالف اکائیاں یک جان ہوجاتی ہیں۔ سائنس نے اسے انسان کے بس میں کر دیا ہے کہ وہ ان مقاصد کو الگ الگ یا ایک ساتھ استعمال میں لاسکتا ہے، جب کہ پرانی اخلاقیات اُسی منافقانہ رویے سے چل رہی ہے۔ کہنا ان کا یہ ہے کہ جنسی جبلت کا مقصد محض افزائشِ نسل کرنا ہے، لیکن رہتے ہر وقت نفسانی خواہشات کے چکر میں ہیں۔

جدید سائنس نے جن دیگر پرانے جنسی نظریات کو باطل قرار دیا اور عورت کی آزادی اور مساوی حیثیت کی راہ ہموار کی، ان میں کنوارپن کا تصور بھی ہے، اور یہ کہ بچہ مرد دیتا ہے، عورت مفعول کا کام کرتی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ مذہب نے ان غیر سائنسی حقائق کی اپنے وقت میں حمایت کی، یا کم از کم تردید نہیں کی۔ پہلی بات یہ ہے کہ کنوارپن کا جو ثبوت مردوں نے مقرر کر رکھا تھا اور نوبیاہتا دلہنوں پر پہلی رات لہو کے نہ آنے پر اس حد تک ظلم ہوتے رہے ہیں کہ عرب ممالک میں آج بھی لڑکیاں شادی سے پہلے ایک آپریشن کے ذریعے اپنے پردے کو مصنوعی طریقے سے بحال کرواتی ہیں، جدید سائنسی حقائق نے اسے باطل ثابت کر دیا اور کہا کہ پردۂ بکارت کا ہونا یا نہ ہونا کنوارپن کی کوئی دلیل نہیں۔ دوسرے عورت محض مفعول یا کھیتی کا کام نہیں کرتی، وہ تخلیقی اور جنسی فعل میں مرد کی برابر کی حصے دار ہوتی ہے، مرد کا بیج ڈالنے کا تصور غلط ہے۔ ایک اور جنسی متھ جس کی وجہ سے عورت نے بے حساب ظلم سہے وہ یہ تھا کہ جب بھی لڑکی پیدا ہوتی، اس کا قصوروار عورت کو ٹھہرا دیا جاتا۔ سائنس نے اسے بھی باطل قرار دے دیا، بلکہ یہ ثابت ہوا کہ لڑکی اور لڑکے کے پیدا ہونے میں مرد کی طرف سے جو کروموسوم آتا ہے، وہ بچے کی جنس متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک یہ عقیدہ عام تھا کہ لڑکی پیدا ہوگی یا لڑکا، اس کا علم صرف ''خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔'' لیکن اب حمل کے ابتدائی مرحلے میں ہی ہونے والے بچے کی جنس کو معلوم کیا جاسکتا ہے، اور غیر مطلوبہ صنف ہونے کی صورت میں حمل گرایا بھی جاسکتا ہے۔ (ہم یہاں قانونی اور سماجی نقطۂ نظر سے بحث نہیں کر رہے۔) حتیٰ کہ جنس کا تعین کرنے کا بھی اختیار سائنس کے ہاتھ میں آرہا ہے۔ بچے کی شکل وصورت کا تعین بھی خدا کے ہی ہاتھ میں تھا، مستقبل قریب کے والدین catalogue دیکھ کر اپنی مرضی سے ہونے والے بچے کی شکل وصورت اور رنگ رکھوا سکیں گے۔ حد تو یہ ہے کہ کلوننگ سے تخلیق اور پیدائش کا سارا عمل ہی انسان کی دسترس میں آگیا ہے، انسان جتنی چاہے روحیں اور اجسام پیدا کرلے۔ ایک شخص جو پیدا ہوگیا ہے، اس کی کئی دوسری ''کاپیاں'' تیار کی جاسکیں گی۔

ایک اور انقلاب جو مستقبل قریب میں آنے والا ہے، اور جس سے عورت کے کھیتی ہونے کا تصور بالکل ہی باطل ہوجائے گا، یہ ہے کہ پیدائش اور افزائشِ نسل کے لیے عورت کا ہونا کوئی ضروری نہیں ہوگا، بچے لیبارٹری میں پیدا ہوسکیں گے۔ ابھی تک تو بات صرف ٹیسٹ ٹیوب

بے بی تک تھی کہ مرد وزن کے جرثوموں کو باہر ہی ملا کر تخلیقی عمل شروع کروا دیا جاتا ہے اور پھر اسے ماں کے اندر باقی کی نشو ونما اور پیدائش کے فطری مراحل کی تکمیل کے لیے رکھ دیا جاتا ہے، لیکن آنے والے زمانے میں (جو بہت دور نہیں) بچے کی پیدائش اور تخلیق کے تمام مراحل عورت کے وجود کے بغیر ہی مکمل کر لیے جایا کریں گے۔

اس سارے تناظر میں یہ بات طے ہے کہ آج اور آنے والے کل کے لیے پرانے زمانے کے جنسی ضوابط اور تصورات اب مزید ساتھ نہیں چل سکتے۔ ہمیں اپنے رویے بدلنے ہوں گے اور اپنے صحت مند مستقبل کے لیے ایک نئی اخلاقیات کو جنم دینا ہوگا۔

مغربی تہذیب کو گالی کیوں؟

تہذیب کے معنی اور اس کی نشو ونما کے قوانین کا سوال اس وقت اہمیت اختیار کر جاتا ہے جب ایک نئی تہذیب تشکیل پا رہی ہوتی ہے اور عالمی ترقی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہو رہا ہوتا ہے۔ مغرب میں ایک طویل سیاہ دور کے بعد جب مذہب کا فکر و نظر پر بہت گہرا اثر تھا، پندرھویں صدی میں روشن خیالی کی تحریک کا آغاز ہوا، تو لوگوں نے سماج، قانون اور مذہب پر وہ سوال اُٹھانے شروع کر دیے جن پر وہ پہلے چرچ کے دیے ہوئے جوابات سے مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ اب لوگ کائنات، خدا اور انسانی زندگی کے بارے میں کلیسا کی ہر بات تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ جستجو کی ایک نئی لہر چل رہی تھی۔ مظاہرِ قدرت کو سمجھنے کی بنیاد عقیدے کی بجائے انسانی محسوسات، مشاہدات اور تجربات پر رکھی جانے لگی۔ اس عمل کے نتیجے میں جدید سائنسی علوم کا جنم ہوا، پرانے تصورات ٹوٹے، کائنات کی تشریح کرنے والے مروجہ روحانی اور مابعد الطبیعیاتی نظریات کا دیوالیہ پن ثابت ہو گیا۔ ایسے میں مغربی تہذیب ایک جست لگا کر آگے بڑھی، صنعتی انقلاب برپا ہوا، صدیوں پرانے انداز بدلے اور جمہوری طرزِ فکر کا آغاز ہوا۔

فکری جمود اور فیوڈل معیشت کے شکار مشرق کے لیے تہذیب و تمدن کی یہ تبدیلیاں ناقابلِ فہم تھیں۔ لیکن کیا مشرق مغربی انداز کی سماجی تبدیلیوں سے بچا رہے گا؟ کیا گلوبلائزیشن کے اس دور میں تہذیبوں کی نوعیت مقامی رہ سکتی ہے؟ کیا کسی تہذیب کے روحانی پہلو کو اس کی اصل قرار دیا جا سکتا ہے؟ تاریخ کا مطالعہ اس کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ عقائد انھی مادی حالات کی عکاسی کر رہے ہوتے ہیں جن حالات میں انھوں نے جنم لیا تھا۔ اگرچہ تہذیب اپنے وقت کی مادی، روحانی اور ثقافتی یکتائی کا نام ہوتا ہے، لیکن ہر تہذیب اپنے اپنے زمانے کے طریقۂ پیداوار (ٹیکنالوجی) اور اس سے وابستہ سماجی نظام سے منسلک ہوتی ہے۔ مثلاً رومن تہذیب کو غلام داری نظام سے جدا کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ یعنی تہذیب طریقۂ پیداوار اور اس کے سماجی ڈھانچے اور ثقافت سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جس طرح کا پیداواری ڈھانچہ مروج ہوتا ہے، اخلاقی قدروں کا نظام اور عقائد اسی پیداواری ڈھانچے کے مفاد اور تقاضوں کے مطابق تشکیل پاتے ہیں۔ مثلاً اگر مغرب نے اپنے ہاں کی عورت کو اس قدر آزادی دی ہے تو یہ اس صنعتی نظام کی ضرورت تھی جس میں وہ رہ رہے ہیں۔ اور اگر ہمیں اس عورت کی ''آزادی اور بے حیائی'' بری لگتی ہے تو اس وجہ یہ ہے کہ ہم ابھی تک فیوڈل پیداواری رشتوں اور اس کے بنائے ہوئے اخلاقی نظام کے زیرِ اثر زندگی گزار رہے ہیں، جس میں عورت ایک ملکیتی شے کے سوا کچھ نہیں۔ اگر ہم بھی عملی اور صنعتی ترقی کی اسی منزل کو پہنچ جائیں تو یقیناً ہمارے خیالات بھی آج سے مختلف ہو جائیں گے۔

کوئی تہذیب اس وقت تک منظر سے نہیں ہٹتی جب تک نئے سماجی تعلقات اور مادی و روحانی قدروں کا ایک نیا نظام وضع نہ ہو جائے۔ آج جب الیکٹرانک میڈیا اور انتہائی تیز رفتار مواصلات نے زمین کے کسی ایک حصے کو دوسرے حصے سے دور نہیں رہنے دیا، ہزاروں میل دور علاقوں کی اشیا بازاروں میں یوں دستیاب ہیں جیسے وہ مقامی پیداوار ہوں، سیٹیلائٹ نشریات ترقی یافتہ قوموں کے رہن سہن، طرزِ معاشرت اور گلیمر سے بھرپور زندگی کو ہر گھر میں لا کر دِکھا رہی ہیں، تو ایسے میں فطری بات ہے کہ پسماندہ معاشرے برتر معیارِ زندگی کی حامل تہذیب کے اثرات سے اپنا دامن بچا کر نہیں رکھ سکتے، اس لیے بھی کہ جدید قدیم پر غالب آتا ہے۔ مغرب کی صنعتی تہذیب سے دنیا کے کروڑوں لوگ متاثر ہو رہے ہیں۔ ان کے علم و ہنر میں کارہائے نمایاں ساری دنیا کے لیے انسپائریشن کا ذریعہ ہیں۔ ان کی سائنسی فتوحات انسانی مستقبل کا یقین ہیں۔ ان کی اعلیٰ سطحی معاشی و ثقافتی ترقی، جمہوری سیاسی نظام، تعلیم کا پھیلاؤ، وہ عوامل ہیں جو مشرق کی پسماندہ تہذیبوں کے لیے قابلِ رشک ہیں۔ ساری دنیا کا جلد یا بدیر صنعتی نظام پیداوار کے دائرے میں آ جانا ایک ناگزیر امر ہے، جس کے نتیجے میں دنیا بالآخر ایک عالمی تہذیبی وحدت میں تبدیل ہو جائے گی اور تہذیبوں کی مقامی نوعیت بدل کر یونیورسل ثقافتی اقدار کا روپ دھار لے گی۔ مختلف اقوام میں ایک

ہی طرح کا نظام پیداوار رائج ہوجانے سے ادب، فن، ثقافت، سیاسی اور قانونی ادارے اور اخلاقی معیار کم وبیش سبھی ایک ہوجائیں گے۔ مثلاً جاپان کی اس کوشش کے باوجود کہ وہ اپنی ثقافتی انفرادیت کو متاثر نہ ہونے دے، صنعتی انقلاب کی وجہ سے وہ مغربی تہذیب کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ ان لوگوں کا کھانا اور لباس مغربی ہوچکا ہے، شادی بیاہ کے روایتی رسم رواج کی جگہ اب مغربی طرز کی شادیوں نے لے لی ہے۔

کوئی تہذیب یا تو ترقی یافتہ ہوتی ہے یا پسماندہ۔ اسے اچھے اور بُرے کے پیمانوں سے نہیں ناپا جاسکتا۔ اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ آپ ہوں تو پسماندہ، لیکن تہذیب آپ کی بہت عمدہ ہو۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ مشرقی تہذیب پر پرانے قبائلی اور فیوڈل نظام کی چھاپ ہے، جبکہ مغربی تہذیب جدید سائنسی معاشرے کی پیداوار ہے۔ ہم لوگوں کے لیے مغربی تہذیب انسانی واخلاقی قدروں سے بالکل عاری ہے۔ صدیوں سے پسماندہ اور جامد ماحول میں رہنے کی وجہ سے ہمارے عوام کے لیے مغربی تہذیب کا ناقابلِ قبول ہونا سمجھ میں آتا ہے، لیکن افسوسناک بات ہے کہ ہمارے دانشور حلقے بھی قوم پرستی اور مشرقیت کے زعم میں مغربی تہذیب کے بارے میں منفی رویہ رکھتے ہیں، کیونکہ نیم خواندہ عوام میں اپنی توقیر بنانے کا یہ ایک سستا طریقہ ہے، اور دوسرے مشرق کے اخلاقی معیار پر پورا بھی اترتا ہے کہ کھلے عام سچ نہ بولا جائے!

مشرق کا عجیب رویہ ہے کہ ہمیں مغرب کی ٹیکنالوجی تو پسند ہے، لیکن تہذیب ہم پرانی ہی برقرار رکھنا چاہتے ہیں، حالانکہ تکنیکی ترقی اور اس سے وقوع پذیر ہونے والی تہذیب وثقافت ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ اس لحاظ سے مغربی تہذیب آج دیگر تہذیبوں کو آگے بڑھنے کے آداب سکھا رہی ہے اور خود اپنے کو بھی خوب سے خوب تر بنانے میں کوشاں ہے، جبکہ ہر خطے کے لوگوں کے رہنے سہنے کے انداز، سماجی رسم ورواج، قوانین، عقائد اور حتیٰ کہ زبانیں بھی مختلف تاریخی مراحل میں بدلتے رہے ہیں۔ مسئلہ صرف ان عوامل کے مطالعے کا ہے، جو کسی قوم کے اندر تہذیبی مظاہر کی اتھل پتھل کا سبب بنتے ہیں۔ مغربی تہذیب کا جنم بھی ایک خاص خطے میں تاریخ کے انھی قوانین کے مطابق ہوا جیسے اس سے پہلے دیگر تہذیبوں کا جنم ہوا تھا۔ اگر مغربی تہذیب گالی ہے تو پچھلی سب تہذیبیں بھی اسی زمرے میں آئیں گی، کہ وہ تہذیبیں آسمان سے نہیں اتری تھیں، وہ بھی اپنے اپنے جغرافیائی ماحول میں انسان کی کئی سو سالہ اجتماعی سرگرمیوں کا نتیجہ تھیں — اور مزے کی بات ہے کہ ہر پرانی تہذیب نئی تہذیب کو گالی دے کر خود تاریخ کے کچرے کے ڈھیر میں نابود ہوجاتی رہی ہے۔

پرانی تہذیب بے وقت کی راگنی ہوتی ہے۔ ہم اسے غیر فطری طور پر گھسیٹ رہے ہوتے ہیں۔ فطری تہذیب وہ ہوتی ہے جو وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہو، جس میں انسان پھلتا پھولتا ہے، آرام دہ محسوس کرتا ہے، مادی اور روحانی مسرتوں سے ہم کنار ہوتا ہے۔ جبکہ غیر فطری تہذیب زندگی کو گھٹن کا شکار بنا دیتی ہے، اس لیے کہ وقت کے ساتھ اس کا بنیادی تضاد پیدا ہوچکا ہوتا ہے، وہ اپنے باشندوں کے لیے باعثِ راحت ہونے کی بجائے انھیں مشکلات سے دوچار کردیتی ہے۔ مثلاً مغربی تہذیب میں ہر بالغ مرد وزن کا خود کفیل ہونا اور چھوٹے خاندان کا تصور معاشرے میں عمومی خوشحالی پیدا کرتا ہے اور انفرادی معیارِ زندگی کو بڑھاتا ہے، جبکہ دوسری طرف مشرق میں آدھی آبادی گھر میں بٹھا دی جاتی ہے اور بچوں پر بچے پیدا کیے جاتے ہیں، اس چیز کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ یہ افعال انفرادی اور قومی معیارِ زندگی کی بربادی کا عمل کس قدر تیز کردیں گے۔ دیانت داری سے غور کیا جائے تو ہماری سب مشرقی قدریں اور رسم ورواج اجتماعی اور انفرادی زندگی کو اجیرن کرنے کے سوا کوئی کردار ادا نہیں کرتیں۔ جبکہ مغربی تہذیب کے رسم ورواج انسانی زندگی کے لیے سہولتیں پیدا کرتے ہیں، اسے خواہ مخواہ بندھنوں سے آزاد رکھتے ہیں، تاکہ انسان خود اعتمادی کے ساتھ مقدور بھر آگے بڑھ سکے۔ ہر فرد اپنے آپ کا ذمے دار ہوتا ہے، کوئی کسی پر بوجھ نہیں بنتا۔

مشرقی تہذیب میں ''دنیا کیا کہے گی'' اور ''کل کی فکر'' ہماری زندگیوں کو اس قدر تباہ کرتی ہیں کہ خود ہمارا وجود اور زندگی دونوں ہی بے معنی بن جاتے ہیں۔ مشرقی باشندوں کی زندگی کے سارے اعمال انھی دو باتوں کے گہرے خوف سے پروان چڑھتے ہیں کہ بے چارے اپنی زندگی کے مقصد سے ہی ناآشنا ہوجاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مشرق کی یہ تہذیب حیات کشی کا روپ دھار چکی ہے جس نے انسان کی زندگی کو

لطائف سے محروم کر رکھا ہے۔ ''دنیا کیا کہے گی'' انسان کے عمل وفکر پر نہ صرف قدغنیں لگا کر فطری صلاحیتوں کو کچل دیتی ہے، ہر کوئی ایک دوسرے سے مخفی وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی اسے ضرورت اور خواہش ہوتی ہے، یا جو فطرت کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بند اور منافق معاشرہ جنم لیتا ہے۔ اس ساری منافقت اور گھٹن کو محسوس کرتے ہوئے بھی سارا معاشرہ اس لیے خاموش رہتا ہے، کہ ''دنیا کیا کہے گی!'' مغربی تہذیب ''دنیا کیا کہے گی'' کے عذاب سے آزاد ہے۔ کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا، آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کہ دوسرا کیا کر رہا ہے۔ ہر فرد دوسرے فرد کی خودمختار (sovereign) حیثیت کو تسلیم کرتا ہے۔ جب تک کسی کا فعل دوسرے کے لیے باعث ضرر نہ ہو، وہ اپنے عمل میں آزاد ہے۔ جب کہ مشرقی باشندہ پورے معاشرے کی نظروں کا قیدی ہوتا ہے، ہر کوئی دوسرے کا ٹھیکیدار — خواہ خود کچھ بھی ہو۔ کوئی کس طرح بیٹھتا ہے، کس طرح اٹھتا ہے، کس طرح کھاتا اور پیتا ہے، کہاں جاتا ہے، کہاں سے آتا ہے، ان سب باتوں کا خیال رکھنا اردگرد کے لوگوں کا اولین فرض ہے۔ کیا ایسی تہذیب میں پلے ہوئے لوگ نارمل قرار دیے جاسکتے ہیں؟

اب آیئے ''کل کے خوف'' کی طرف۔ مشرقی باشندوں کو قدرت جتنے ''آج'' فراہم کرتی ہے، وہ انھیں کل کے خوف میں تج دیتے ہیں اور بالآخر ساری زندگی گنوا کر دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ آنے والے وقت کی فکر اور خوف اس قدر ہوتا ہے کہ پوتے پوتیوں کی فکر میں نہ خود آرام سے بیٹھتے ہیں نہ اردگرد کے لوگوں کو چین سے بیٹھنے دیتے ہیں۔ کل کی فکر اہلِ مغرب کا مسئلہ نہیں۔ انھیں پتا ہے زندگی صرف ایک بار ملتی ہے، اس کا ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی ہے، اس لمحے کا جتنا رس نچوڑا جاسکتا ہے نچوڑ لیا جائے۔ چنانچہ وہ خوب محنت کرتے ہیں اور اپنی کمائی کو خود پر خود خرچ کرتے ہیں۔ اپنی پیدا کی ہوئی دولت کو اپنے اوپر خرچ کرنا انسان کا بنیادی استحقاق ہے۔

مشرقی تہذیب میں اجتماعی اور خاندانی نظام کچھ اس طرح بنا ہوتا ہے کہ اس میں فرد کو خودکفیل نہیں بننے دیا جاتا، اس لیے کہ خودکفالتی سے گھر میں بڑے کی اور معاشرے میں جاگیردار کی آمریت ختم ہوتی ہے۔ نہ کوئی خودکفیل بنے نہ لوگ ایک دوسرے سے آزاد ہوں۔ خودکفالت دشمنی کی وجہ سے مشرقی معاشروں کی دو تہائی آبادی بے کار رہتی ہے۔ اس بیکاری کو خوش کن اخلاقی وجذباتی قدروں نے مزید تقویت دی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر کوئی اپنے عزیز واقارب کا جذباتی رشتوں کے حوالے سے استحصال کرتا ہے — ماں باپ اولاد کا، بچے والدین کا، بہنیں بھائیوں کا، بھائی بھائی کا، دوست دوست کا۔ غرضیکہ ہر کوئی دوسرے کو جذباتی بلیک میل کر کے اس سے فائدہ اٹھا رہا ہوتا ہے، چنانچہ لوگوں کو مفت خوری اور آسان راستوں سے زندگی گزارنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ کام چوری، کاہلی، مفت خوری اور دوسروں پر مفت بری کا رعب مشرقی معاشرے کی خاص خصوصیت ہیں۔ جبکہ مغرب میں کوئی کسی پر انحصار نہیں کرتا، دوسروں پر انحصار کرنا غیر اخلاقی حرکت سمجھی جاتی ہے، اور ہر کوئی اپنی زندگی اپنے طور پر گزارتا ہے۔

مشرقی معاشرے کا فرد اس سے قطعی طور پر بے نیاز ہوتا ہے کہ اس کے کسی عمل سے گردوپیش کے لوگ کس قدر پریشان ہو رہے ہیں۔ پبلک مقام پر اونچی آواز سے باتیں کرنا، چیخنا چلّانا یا شور مچانا کسی کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، اور آس پاس کے لوگ بھی کمال حیرت سے شور کو برداشت کرتے ہیں۔ جبکہ مغرب کا معاشرہ سکون پسند معاشرہ ہے۔ وہ لوگ بڑے آرام اور سکون کے ساتھ دھیمے لہجے میں محوِ گفتگو ہوتے ہیں۔ مذہب کے نام پر بھی کسی کو شور مچانے اور کمیونٹی کا آرام خراب کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مغربی معاشرے کے افراد میں یہ احساس ہر آن قائم رہتا ہے کہ آپ کے کسی عمل سے دوسرے کو کوئی تکلیف نہ ہو، دوسرے کا حق مجروح نہ ہو۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی قطار توڑ کر آگے بڑھ جائے۔ جب کہ مشرق میں قطار بنانا غیر فطری فعل لگتا ہے، چنانچہ مغربی تہذیب کی نشانی اگر بن بھی جائے تو جلد ہی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ سیاست میں بھی کوئی پارٹی اپوزیشن میں رہ کر اپنی باری کا انتظار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی، چاہے پورا سسٹم ہی برباد کیوں نہ ہو جائے۔ ہم سیاست دانوں سے نالاں ہوتے ہیں کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، حالانکہ یہ عمل جب اور جہاں موقع ملے ہم روز دہراتے ہیں، لیکن یہ بھی مشرق کا ہی خاصہ ہے کہ دوسروں پر تنقید کی جائے، اپنے کو آئینے میں نہ دیکھا جائے۔

مشرق میں اگر کسی کو ایسے کام سے روکا جائے جس سے آپ دوسروں کے آرام میں مخل ہو رہے ہوں، تو ٹکا سا جواب ملے گا۔ ہوسکتا ہے

سر پھٹول اور جھگڑا بھی ہو جائے۔ مغرب میں ویسے تو کوئی دوسرے کے لیے آزار کا باعث بننے والا کام ہی نہیں کرتا، اور اگر کرے بھی تو صرف ناپسندیدہ نظر ہی اسے روکنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ مشرقی تہذیب چونکہ باہمی جبر اور زیادتیوں سے عبارت ہے، اس لیے برداشت اور خاموش رہنے کا مادہ بھی بہت ہوتا ہے۔ یہاں پر دوسروں کے ظلم اور ناانصافیوں کو برداشت کرنے کا باقاعدہ سبق پڑھایا جاتا ہے اور یہ مشرق کی ''اعلیٰ'' قدروں میں سے ایک بڑی قدر ہے، لہٰذا لوگ عام طور پر اپنے پر ظلم اور زیادتی سہہ جاتے ہیں اور بولتے نہیں۔ صدیوں کے اس رویے نے لوگوں کے اندر نہ احساسِ زیاں رہنے دیا ہے اور نہ اپنے حقوق کا شعور۔ ردّعمل کے طور پر لوگ احساسِ فرض سے بھی عاری ہو چکے ہیں۔ نہ کوئی مطالبہ کرتا ہے، نہ احتجاج، تو پھر فرض کی انجام دہی کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ مشرقی تہذیب کا ایک محاورہ ہے، ''سب چلتا ہے۔'' جبکہ مغرب میں سب نہیں چلتا، اصول چلتے ہیں، قاعدہ اور قانون چلتا ہے، نظام اور ادارے چلتے ہیں۔ سارا معاشرہ بذاتِ خود ایک ادارہ ہوتا ہے، جس میں ہر شخص مساوی طور پر اپنے حقوق و فرائض سے آشنا ہوتا ہے۔ نہ کوئی فرض سے کوتاہی کرتا ہے، نہ اپنے حق سے محروم رہتا ہے۔ جب کہ مشرقی تہذیب میں بڑی سے بڑی قومی لوٹ مار، دھاندلی، بے ایمانی اور اصول شکنی عوامی اور قانونی مواخذے سے محفوظ ہوتی ہے۔ مغرب میں اس لوٹ کا کوئی عشرِ عشیر بھی نہیں سوچ سکتا۔ دروغ گوئی بھی مشرق کا ایک خاصہ ہے، جب کہ روزمرہ معاملات میں مغرب والے جھوٹ کے استعمال سے ناآشنا ہیں۔ چنانچہ وہاں مشرقی باشندے قانونی حیثیت اختیار کرنے یا دیگر فوائد لینے کے لیے جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہیں، اور وہ نہایت معصومیت سے اسے سچ تسلیم کر لیتے ہیں (اگرچہ اب وہ ہوشیار ہو گئے ہیں)۔

مغرب کا ایک بڑا ہی بنیادی اصول راست باز (straightforward) ہونا ہے، اور یہ وہاں کی ایک بڑی اخلاقی قدر ہے۔ جب کہ مشرقی میں صاف گوئی پر بُرا منا لیتے ہیں، چنانچہ ہر چھوٹے بڑے معاملے پر لوگ اندر سے کچھ ہوتے ہیں اور باہر سے کچھ اور۔ مشرقی تہذیب میں سماجی تعلقات میں منافقت ایک عام سی بات ہے، جب کہ آپ مغرب میں کسی سے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، صاف صاف کہہ سکتے ہیں، اور سننے والا بھی برا منانے کی بجائے آپ کی بات کو معروضی تناظر میں دیکھتا ہے۔

مغرب کی ایک اور بڑی خاصیت وقت کی قدر ہے۔ ہر کام وقت پر، منصوبہ بندی سے، ترتیب اور شیڈول کے مطابق کرنا ہوتا ہے، کوئی لمحہ بے مقصد نہیں گزارا جاتا۔ جب کہ مشرق میں لوگوں کے پاس ٹائم بہت ہوتا ہے، اور وہ ہر دم اسے ''پاس'' کرتے رہتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ دنیا کی غالب آبادی پر مشتمل اتنی بڑی انسانی طاقت، لیکن وقت کو صرف ''پاس'' کر کے مزہ لیتی ہے۔ یہ بھولے نہیں جانتے کہ وہ وقت کو پاس نہیں کرتے، وقت انھیں پاس کر رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے تاریخ انھیں بہت پیچھے چھوڑ چکی ہے، لیکن انھیں اس کا احساس نہیں۔ ہمارے ہاں سب کام خواہ وہ انفرادی ہوں یا قومی سطح کے، جامع منصوبہ بندی کے بغیر، بے ربط اور ایڈہاک بنیاد پر یعنی محض وقت ٹپانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے، ان سے وہ نتائج نہیں نکلتے جن کا دعویٰ کیا گیا ہوتا ہے۔ اپنے ہی اعلان کردہ وقت پر کسی کام کا آغاز کرنا ہر چھوٹے بڑے کے مزاج کے عین خلاف ہے۔ مغرب میں ہر کام وقت پر شروع ہوتا ہے اور ٹھیک پہلے سے طے شدہ وقت پر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ''مشرق'' میں جو مزہ اصول شکنی میں ہے، اس کا جواب نہیں۔ یہاں اگر کوئی اصول پر کاربند رہ لے تو وہ بھی اندر سے بے کلی محسوس کرتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ ہماری تہذیب اور اصول پرستی نہ جانے کب سے ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں۔ مشرقی معاشروں میں دھوکے اور فریب کے بادل ہر آن چھائے رہتے ہیں۔ ہر انسان دوسرے انسان سے خوفزدہ ہوتا ہے، کہ نہ جانے کب کوئی کس وقت کسی کو دھوکا دے جائے۔

مشرق میں زیادہ تر حصے میں قدرت نے گرمی کا موسم ہی عطا کیا ہے۔ مشرق کے باشندے ہزارہا سال سے اس جغرافیائی ماحول میں رہ رہے ہیں لیکن پھر بھی کاروبارِ زندگی کی طرف دھیان کم اور موسم کی شدت کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ گرمیوں میں چستی سے کام اس لیے نہیں کرتے کہ گرمی بہت ہے، اور سردیوں میں اس لیے نہیں کہ ٹھنڈ بہت ہے۔ بارش ہو جائے تب کوستے ہیں، نہ ہو تب کوستے ہیں۔ اُدھر مغرب میں نقطۂ انجماد سے گرے ہوئے موسم میں بچے جوان اور بوڑھے سبھی چاق و چوبند، زندگی کے سب کام حسبِ معمول جاری۔ ان کے ہاں

بارش عام معمول ہے، لیکن کام نہیں رکتا۔ سب سیدھے اور تنی ہوئی گردنوں کے ساتھ چل رہے ہوتے ہیں۔ جب کہ مشرقی لوگ طبعاً ڈھیلے ڈھالے اور سہل پسند ہیں، پیٹ نکالے، بے ہنگم جسم، اور اوپر سے ڈھیلے مشرقی لباس، جو نفسیاتی طور پر ہی سستی میں دفن کر دیتے ہیں۔

مشرق والے مغرب والوں کو مادہ پرست کہتے تھکتے نہیں، حالانکہ یہاں مادہ پرستی کمینگی اور لوٹ مار کس حد تک پائی جاتی ہے، سماجی سطح پر اس کا ایک علامتی ثبوت تحفے تحائف کے لینے دینے میں نظر آتا ہے۔ یورپ کی سماجی روایات میں ایک دوسرے سے دوستی اور محبت کے اظہار میں پھولوں کے تحفے کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ وہاں مہنگے اور قیمتی تحفے دینا معیوب سمجھا جاتا ہے، جب کہ مشرق میں ''دکھاوا'' سر چڑھ کر بولتا ہے، اور تحفے میں فقط وہی چیزیں دی جاتی ہیں جو مادی قدر رکھتی ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ سماجی تقریبات محض مال اکٹھا کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ مشرق کے لوگ خالصتاً خلوص اور محبت کے حوالے سے تحفہ دینے اور لینے کے جذبات سے عاری ہیں۔ مغرب کے لیے مادہ تحقیق اور جستجو کا ذریعہ ہے، وہ جب مادی لذتوں سے بھی ہم کنار ہو رہے ہوتے ہیں، ان کی وارفتگی سے یہ لگتا ہے کہ وہ اس وقت بھی مادے کی نیرنگی سے مزہ لے رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ مشرق کے وہ لوگ جن کی ساری زندگی پیسے اور مادی مفادات کی پوجا میں گزرتی ہے اور جو اپنی ذاتی خوشی کی خاطر پیسے کے استعمال سے ہی ناواقف ہیں، وہ خوشحال مغرب کے لوگوں کو مادہ پرستی کا طعنہ دیتے ہیں۔ مشرقی کے لوگ خرچ اگر کریں گے تو نہایت بھونڈے طریقے سے اور اس میں بھی نمائش سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے۔

مشرق والوں کا سب سے پسندیدہ موضوع مغرب کی ''جنسی بے راہ روی'' اور ان کا کمزور خاندانی نظام ہے۔ دراصل ہم لوگوں کے لیے اپنے سے مختلف ماحول کی معروضیت کو سمجھنا مشکل ہے۔ ہم مظاہر کو علت و معلول اور تاریخی تناظر میں رکھ کر نہیں دیکھتے۔ سمجھتے ہیں کہ ہر چیز اللہ میاں نے جوں کی توں بنائی ہے۔ اپنے سے مختلف چیزوں کو فوراً برا اور غلط قرار دے دیتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ رہن سہن، معاشرتی نظام اور اخلاقی معیارات جامد ہوتے ہیں نہ مقدس۔ یہ سماجی تبدیلیوں اور بقا کی ضرورتوں کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ مغرب والے اس حقیقت کو جان گئے کہ جو اخلاقی نظام سماج اور فرد کو آگے بڑھانے میں رکاوٹ بن جائے، اسے ترک کر دینا چاہیے۔ مغرب میں جب ہر شخص معاشی طور پر خود مختار ہو گیا اور سائنس نے حیات و کائنات کے بارے میں نئی تفہیم پیدا کر دی تو ایک نئی اخلاقیات نے جنم لیا جس سے تمام افراد باہمی دباؤ اور سوسائٹی کے جبر سے آزاد ہو گئے۔ دراصل مغرب کے انسان نے اس راز کو پالیا کہ سب سے مقدم چیز خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی خوشی ہے اور ماضی کے سب تقدیسی ہالے اس کے اپنے ذہنِ رسا کی تخلیق تھے۔ ہمارا روحانی فلسفہ انسان کو اشرف المخلوق کا درجہ ضرور دیتا ہے، لیکن اس کے بعد انسان کو اپنی مکمل نفی اور تذلیل کرنے کو کہتا ہے، اس سے اس کی ہر اپنی چیز چھین لیتا ہے۔ نہ اس کے پاس دماغ رہنے دیتا ہے، نہ اپنی جبلتوں پر اس کا کوئی اختیار۔ اسے ایک خیالی اور ماورائی آسمانی ذات کا غلام بنا دیا جاتا ہے۔ انسان کو کہا جاتا ہے، تمھارا اپنا کچھ بھی نہیں، تم اس کی عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہو، تمھارا سب کچھ اسی کا ہے۔ تم کو جو کچھ ملا ہے اپنی کوششوں سے نہیں، اسی کے کرم و احسان اور مرضی سے ملا ہے۔ تم ایک حقیر سی چیز ہو، ڈرو، جھکو اور اپنا آپ بھول جاؤ۔ تمھیں خود پر کوئی اختیار نہیں، تمھیں عارضی طور پر اور امتحان کے لیے اس زمین پر بھیجا گیا ہے، اور جو بھی لذتیں لینی ہیں مرنے کے بعد لینا۔ اور اگر اسے نہ مانا تو جہنم کے شاہکار قسم کے عذاب تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ اس تناظر میں بے چارے انسان میں انسان نام کی کوئی چیز باقی رہ جانی مشکل ہی ہے۔

لیکن مغرب کے انسان نے دیکھا کہ مرنے کے بعد زندگی ہے یا نہیں، البتہ یہ زندگی سراسر مادی اور خاکی ہے۔ اس زندگی میں جو کچھ بھی پیش آتا ہے، اسے خود ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ ہم اس دنیا اور اس کے ماحول کو اپنی کوشش اور عقل سے بہتر کر سکتے ہیں۔ بصورت دیگر کچھ نہ کرنے سے اپنا ہی نقصان ہو گا اور اگر اسے بہتر کر لیا تو اپنی زندگی آرام دہ اور پر لطف ہو جائے گی۔ انسان کو اپنی دنیا خود ہی بنانا ہوتی ہے، لہٰذا اپنی ذہنی، جسمانی اور روحانی لطافتوں کی حسوں کو سامان تسکین بہم پہنچانے کا اس کو پورا حق حاصل ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں جنسی اور جمالیاتی لحاظ سے گھٹ کر مرنے کا نام ''پاک'' زندگی ہے۔ فطری خوشیوں اور مسرتوں پر اگر سماجی قواعد کے سخت پہرے لگا دیئے جائیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ذہنیت ہی ننگی ہو جاتی ہے۔ مغرب والوں کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ کس کا کون سا جسمانی حصہ دکھائی دے رہا ہے، جب کہ ہم پاک بازوں کو اس کے سوا کچھ اور سجھائی نہیں دیتا۔ شرم و حیا کے معاشرے میں پلے ہوئے لوگ انسان کو انسان نہیں جنسی پتلے سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے

تھا کہ ان شرم وحیا کے پیکروں سے جنسی احساس ختم ہو جاتا لیکن ہوا اُلٹ۔ ہم چلتے پھرتے مرد وزن کو انسان اور افراد کے طور پر نہیں، ان کے جنسی اعضا کے طور پر دیکھتے ہیں، چنانچہ ان دونوں کو آپس میں ملنے اور قریب آنے سے بچاتے ہیں۔ جنسی اعضا اور برہنہ اجسام میں سب سے زیادہ دلچسپی اور تجسس بھی ہمیں لوگوں کو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شرم وحیا کی ساری تھیوری غیر سائنسی اور غیر فطری ہے۔ کوئی دوسرا ننگا نہیں ہوتا، ننگا پن دیکھنے والوں کی اپنی نظر اور ذہن میں ہوتا ہے۔ یہ دعویٰ روزِ روشن کی طرح حقیقت ہے کہ مغرب میں عورت کی عزت جتنی محفوظ ہے، اتنی ہمارے ''پاک معاشرے'' میں نہیں۔ وہاں جوان لڑکی ملکوں ملکوں اکیلی سفر پر نکل پڑتی ہے، ہوٹلوں میں اجنبی مردوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رات بسر کرتی ہے، لیکن کیا مجال کہ کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے۔ کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں کچھ نہیں ہوتا، لیکن وہاں آزادی کی نسبت اتنا کم کہ زبردستی کا واقعہ پورے ملک کی ہی نہیں، بین الاقوامی خبر بن جاتا ہے۔ مغرب میں تمام تر آزادی کے بعد بھی عورت 90 فیصد محفوظ ہے، جبکہ مشرق میں 90 فیصد غیر محفوظ۔ شرافت، حیا اور پردے کے خول نے ہمیں جنسی مریض بنا رکھا ہے۔ زندگی کے خوبصورت معنوں سے صرف مغرب کا انسان ہی آگاہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ حقیقی زندگی مغرب کے لوگ گزار رہے ہیں، ہم زندگی بھگتنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارا معاشرہ خوشی کا قاتل ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں جو انسان ہونے پر ہی شرمندہ ہیں۔ اپنے جسم کو گناہ اور بدن کو پلید سمجھتے ہیں۔ اس کی طبعی خواہشوں کو کچلتے اور دباتے ہیں۔ دیکھا جائے تو حقیقی معنوں میں ''جنسی بے راہ روی'' پر چلنے والے ہم نام نہاد حیادار ''مشرقی'' لوگ ہیں۔ مغرب نے جنس کو ٹھیک سمجھا ہے اور وہ لوگ مکمل انسانی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ اپنے نفع ونقصان کے خود ذمے دار ہیں، کسی بھی صورت حال میں خود فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا کرنا ہے، اس کے نتائج کا سامنا بھی خود ہی کرتے ہیں اور ان نتائج کا مزید تجزیہ کر کے اپنے مستقبل کے لیے راہیں متعین کرتے ہیں۔

اور جہاں تک مغرب کے ''کمزور'' خاندانی نظام کا تعلق ہے، ہمارا یہ خیال بھی مبالغہ آمیزی اور ان لوگوں کے پروپیگنڈے کا مرہونِ منت ہے جو خاندانی اقدار کے نام پر مرتے ہوئے فیوڈل سماجی نظام کو بچانا چاہتے ہیں۔ مغرب کے خاندانی نظام پر مندرجہ ذیل بڑے بڑے اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں:

- چھوٹی عمر میں بچے ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں۔
- ماں باپ کو تنہا زندگی گزارنی پڑتی ہے۔
- بوڑھے اور عمر رسیدہ لوگوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا، انھیں اس مقصد کے لیے بنائے گئے ''بوڑھے لوگوں کے ہاسٹل'' میں بھیج دیا جاتا ہے۔

یہ سراسر لغو اور غیر حقیقی بات ہے کہ مغرب میں والدین اور بچوں کے مابین فطری پیار کا بندھن نہیں ہوتا، وہ محض بچے پیدا کرتے ہیں، کچھ عرصہ پاس رکھتے ہیں اور پھر انھیں یا تو نکال دیا جاتا ہے یا وہ والدین کا گھر خود ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی والدین اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت جس محبت اور لگن سے کرتے ہیں ہم اس معیار کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہمارے اور ان کے درمیان بنیادی فرق والدین کی فطری محبت کے کم یا زیادہ ہونے میں نہیں، بلکہ بچوں کو اپنی ''ملکیت'' سمجھنے اور نہ سمجھنے میں ہے۔ ہمارے خاندانی نظام میں اولاد کو جائیداد کی طرح ملکیت سمجھ کر سلوک کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کے والدین میں محبت کم اور ملکیتی جذبہ (possessiveness) زیادہ ہوتا ہے۔ جب کہ بچوں کے ساتھ حقیقی محبت کا اظہار صرف مغرب کے والدین میں پایا جاتا ہے جو ہماری طرح بچوں پر ''سرمایہ کاری'' نہیں کرتے کہ کل اس سے فائدہ اور منافع حاصل کیا جا سکے۔ مغرب کے والدین اپنے بچوں کی ممکن حد تک بہترین تربیت کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں ان کی اپنی انفرادیت کی قربانی بھی نہیں مانگتے۔ بالغ ہونے پر اپنا بچہ صرف ''اپنا بچہ'' ہی نہیں ہوتا، وہ ایک فرد اور شخصیت بھی ہوتا ہے۔ اس کی اپنی انا ہے، اپنا وجود ہے، اپنا ذہن اور دماغ ہے۔ وہ سوچ سکتا ہے، اچھے برے کی تمیز کر سکتا ہے، اسے اپنی ذات، زندگی اور مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا حق ہونا چاہیے۔ بچوں کی پیدائش ایک جبلی فعل ہے، تاکہ بقائے نسل ممکن ہو سکے۔ ہر نسل نے بالغ ہو کر اپنی آئندہ نسل

کی پیدائش اور تربیت کا ذمہ لینا ہوتا ہے اور وہ اس کی کماحقہٗ ادائیگی اسی وقت کرسکتی ہے جب وہ پچھلی نسل کے شکنجے سے آزاد ہو۔ نسلوں نے آگے کو چلنا ہوتا ہے، پیچھے کو نہیں۔ یہ مغربی والدین کی عظمت ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اس نکتے کو پایا کہ بچوں کو سدا اپنا بچہ ہی نہیں رہنے دینا چاہیے بلکہ ان کو خودمختار فرد کے طور پر تسلیم کر لینا سماج اور صحت مند نسلوں کے لیے بہترین ہے۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ ہر نسل اپنی کفالت خود کرنے لگ جاتی ہے، کوئی کسی پر بوجھ بن کر ایک دوسرے کے معیارِ زندگی کو کم نہیں کرتا۔ اور دوسرے ہر فرد جواں سالی میں ہی ذمہ دار شہری کا کردار سنبھال لیتا ہے۔ لڑکی ہو یا لڑکا، اس نے سماج اور ریاست کے سامنے اپنے افعال کے لیے خود ہی جواب دہ ہونا ہے۔ جب نوجوان اپنے فیصلے آپ کرتے ہیں، ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح ان کی پیداواری صلاحیتیں بڑھتی ہیں جو معاشرے کو مجموعی طور پر مزید خوشحال کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ چنانچہ مغرب کا بچوں کے بارے میں رویہ زیادہ سائنسی، عقلمندانہ اور سب کے لیے مفید ہے۔ بچے جوان ہونے پر دوطرفہ خوشی اور رضامندی سے الگ ہوتے ہیں۔ مغرب میں نوجوان نسل کی جو ''بربادی'' ہمیں نظر آتی ہے، اس کا وہاں کوئی وجود نہیں۔ کوئی بھی سوسائٹی اپنی نسلوں کو برباد کر کے ارتقا اور ترقی کی طرف نہیں بڑھ سکتی، جب کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور خوشحال اقوام ہیں۔ اگر ان کا بچپن اور نوجوان اتنا ترس کھانے والی حالت میں ہوتا تو دنیا کی بہترین دماغی اور پیداواری صلاحیتیں ان کے پاس نہ ہوتیں۔ انھوں نے nuclear family کا فلسفہ دے کر فرد اور معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کے رستے کھول دیے۔ کوئی کسی کا محتاج نہیں، ہر ایک کو خود کمانا ہوتا ہے، کوئی کسی کے سہارے نہیں رہ سکتا۔ امیر ترین خاندان کی اولاد بھی آغازِ بلوغیت پر کام کر کے کمانا سیکھتی ہے تاکہ وہ محنت اور پیسے کی اہمیت کو پہچان سکے اور کسی کو حرام اور مفت کمائی پر پلنے کی عادت نہ پڑے۔ اگر کسی چھوٹے سے یورپین ملک کی فی کس قومی پیداوار ہمارے جیسے کروڑوں کی آبادی کے ملک بلکہ کئی ملکوں سے زیادہ ہے تو اس لیے کہ ان کے خاندان کا ہر شخص کام کر رہا ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام کے پیچھے رمز یہ تھی کہ خاندان کی آمدنی کا وسیلہ موروثی اور ایک ہی ہوتا تھا— زراعت یا خاندانی پیشہ۔ آج خاندان کے ہر فرد کی آمدن کا وسیلہ مختلف ہوتا ہے، اور اس کی آمدنی بھی یکساں نہیں ہوتی۔ ایک بھائی سروس کر کے کما رہا ہے، دوسرا کاروبار چلا رہا ہے، تیسرا ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ چنانچہ آج کے حالات میں مشترکہ خاندانی نظام نہیں چل سکتا۔ ہماری اجتماعی ترقی اور انفرادی مفاد اسی میں ہے کہ ہم مغرب کے خاندانی نظام کی اچھائیوں کو جلد اپنا لیں، ورنہ تاریخ تو ہمیں اس طرف جانے پر مجبور کر ہی رہی ہے۔

''مشترکہ خاندان'' کا نظام مفت خوری اور حرام خوری کی عادت ڈال کر نسلوں کو معذور کر دیتا ہے۔ ایک کما رہا ہے، دس کھا رہے ہیں، چنانچہ معیارِ زندگی بہتر کس طرح ہوسکتا ہے۔ مشترکہ خاندان انفرادی خوشیاں کھا جاتا ہے۔ پہلے بڑا بیٹا کولھو کا بیل بنتا ہے، بے چارہ ماں باپ کی ذمے داریاں نبھاتے نبھاتے خود اپنی خوشیاں قربان کر دیتا ہے۔ اس سوسائٹی کی عورتیں ویسے ہی عضوِ معطل ہیں— شوپیس اور گھریلو خدمتگار۔ عام طور پر جہیز کا احسان کر کے انھیں وراثت (ملکیت) سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ طلاق ہو جائے تو ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ مغرب کے لوگ تو پالتو کتے بلی پر جان نچھاور کر دیتے ہیں، اپنے بچوں سے وہ کتنی محبت رکھتے ہوں گے، اس کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ مغربی تہذیب کو بدنام اور اپنے بوسیدہ خاندانی نظام کی پردہ پوشی کے لیے مغرب کے بارے میں افسانے مشہور کر رکھے ہیں۔ وہاں ہر فرد قابلِ عزت اور خودمختار ہے۔ ہمارے معاشرے کی طرح کوئی رشتے دار دوسرے رشتے دار کو جذباتی بلیک میل نہیں کرتا۔ یورپ کے ماں باپ اولاد کی خوشی کو اپنی خوشی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے ہیں۔ نہ اولاد ماں باپ پر بوجھ ہے اور نہ ماں باپ اولاد پر۔ ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے؟ والدین اگر دولت مند ہیں تو پھر ان کی خدمت کا بھرم رکھا جاتا ہے۔ مفاد کی خاطر ان کی جائز ناجائز مانی جاتی ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر نچلے درمیانہ طبقے کے والدین جوان اولاد پر اپنے فیصلے زبردستی ٹھونس کر ان کی خوشی اور ترقی کے راستوں کو پامال کر دیتے ہیں۔ حقیقی باہمی محبت اور احترام کا پتا ایک ایسے نظام میں ہی چل سکتا ہے جہاں ماں باپ اور اولاد دونوں آزاد ہوں۔ ہمارے ہاں سب زبردستی کے رشتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے اگر کچھ کیا جاتا ہے تو اس لیے کہ دنیا کیا کہے گی۔ یا پھر قربانی کا بکرا بن کر ماں باپ، بہن بھائیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی اور اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ مغرب کے مقابلے میں ہمارے ہاں خاندانی نظام کسی بھی طور پر آئیڈیل نظام نہیں ہے۔ یہ فرد کی خوشی اور سماجی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ بات ''خاندان'' کی خوشی کی نہیں، افراد کی خوشی کی ہونی چاہیے۔ ''خاندان'' تجریدی لفظ ہے، اصل چیز افراد ہوتے ہیں۔ اگر افراد خوش نہیں تو ''خاندان'' کی خوشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

مغرب میں بڑے بوڑھے قابلِ رحم زندگی نہیں، عیش کے دن گزارتے ہیں، لیکن ایک ایسے معاشرے کے لیے اسے سمجھنا ذرا مشکل ہے جہاں ایک دوسرے کے سہارے پڑے رہنا اخلاقی قدر ہو۔ بڑھاپا اس سے بڑا مزیدار اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ آپ کسی کے محتاج نہیں، کسی پر بوجھ نہیں اور بڑھاپے میں بھی آپ اپنی مرضی ومنشا سے رہ سکیں۔ ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مغرب کا معاشرہ وہاں کے لوگوں کی رضا و رغبت سے قائم ہے۔ ہمیں ان پر ''ترس'' کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مغرب کے بوڑھے آخری دم تک پوری active زندگی گزارتے ہیں۔ وہ ممکنہ حد تک اپنی صلاحیتوں کے مطابق خود کو معاشی لحاظ سے مفید اور خود کفیل بنائے رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تفریحی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آنے دیتے۔ انھوں نے بڑھاپے کے لیے بھی مصروفیت کا ایک شیڈول طے کر رکھا ہوتا ہے۔ اس لیے انھیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔ ہمارے بوڑھے عضوِ معطل بن کر محتاجی کی زندگی گزارتے ہیں۔ اسی لیے وہ اپنے عزیزوں کے سہارے اور قربت کے خواہاں رہتے ہیں۔ اور جب ان کی اولاد اپنے حالاتِ زندگی کی وجہ سے ان کے پاس رہنے سے قاصر ہوتی ہے، تو وہ ان کے محبت اور خلوص کے شاکی ہو جاتے ہیں یا اولاد کے پاؤں کی زنجیر بنے رہتے ہیں، جب تک زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔

معروضاتِ بالا سے ہم اس بات کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مشرق اور مغرب میں فرق صرف پسماندگی اور ترقی کا ہے۔ انھیں دو متضاد نظاموں کے طور پر ہمیں نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے نظام نہیں ہیں، بلکہ ایک ارتقا میں پیچھے ہے اور ایک آگے ہے۔ تاریخ ہمیشہ آگے کو سفر کرتی ہے۔ ہمیں مٹ جانا ہوگا یا پھر آگے کو جانا ہوگا۔ ہم جہاں کھڑے رہنا چاہتے ہیں یا ماضی کے کسی مقدس اور سہانے دور میں پیچھے جانا چاہتے ہیں، مگر یہ ممکن نہ ہوگا۔

روایتی لباس — ترقی میں رکاوٹ

لباس کسی شخصیت کا آئینہ ہی نہیں ہوتا، اس سے قوموں کی نفسیاتی، ذہنی، سماجی، ثقافتی اور معاشی حالت کا بھی پتا چلتا ہے، اور اس بات کا بھی کہ وہ ترقی کے کس دور سے گزر رہے ہیں۔ جیسے کوئی بھی چیز ہمیشہ سے موجود نہیں، لباس کا استعمال اور اس کا تصور بھی روزِ ازل سے انسان کے ذہن میں نہیں آیا۔ دیومالائی اور مذہبی روایات کے مطابق ''جنت'' میں آدم وحوا ننگے ہی رہا کرتے تھے۔ ہم آج قدیم انسان کی جو تصویریں دیکھتے ہیں، جن میں وہ ہمیشہ مخصوص جسمانی حصوں کو چھال اور پتوں سے ڈھانپے دکھائی دیتے ہیں، اس کے لیے دو باتیں فرض کی جاسکتی ہیں: اوّل یہ کہ یہ اس دور کی تصاویر ہیں جب جسم کے بعض حصوں کو ڈھانپنے کی ضرورت اور تصور پیدا ہو چکا تھا، اور دوم چونکہ ہمارے اپنے زمانے کی معاشرتی اخلاقیات اور تہذیب کا تقاضا ہے کہ انسانی جسم کو قدرتی حالت میں نہ دکھایا جائے، خواہ قدیم انسان کا ہی ذکر کیوں نہ ہو رہا ہو، چنانچہ ہم خود ہی اس کے مخصوص حصوں کو ڈھانپ دیتے ہیں۔

پہلے پہل جب انسان نے اپنے جسم کو ڈھانپنا شروع کیا تو سب سے پہلے اس نے اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو ہی کیوں زیرِ جامہ کیا؟ ایسا اس نے باتمیز بننے یا شرم وحیا کی وجہ سے نہیں کیا تھا، عملی زندگی کی سرگرمیوں میں اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ حصے نہ صرف بقائے حیات کا مرکز تھے، بلکہ نہایت نازک بھی۔ اس دور میں ناموافق حالات کی وجہ سے قدیم انسان اپنی نسلی بقا کی یقین دہانی کے لیے وہم (obsession) میں مبتلا رہتا تھا، اسے گھنے جنگلوں، جھاڑیوں، ٹہنیوں اور کانٹوں بھری گزرگاہوں میں گھومنا پھرنا، جانوروں کے ساتھ گتھم گتھا ہونا ہوتا تھا، اور چھینا جھپٹی کی باہمی لڑائیوں میں جہاں اس نے ہتھیار ایجاد کیے، وہاں لگتا ہے کہ جسم کے نازک حصوں کو محفوظ کرنے اور انھیں ڈھانپنے کا تصور پیدا ہوا، جو تمدن کے ارتقائی عمل میں جسم کے مزید حصوں کو ڈھانپنے پر منتج ہوا۔ وقت کے ساتھ انسانی جلد بھی خوراک اور ماحول کے تبدیل ہونے سے نرم ونازک ہوتی رہی، چنانچہ موسمی اثرات نے بھی جسم کو ڈھانپنے میں کردار ادا کیا۔ جہاں تک لباسوں کی وضع قطع کا تعلق ہے، اس میں مقامی طور پر میسّر خام مال، جغرافیائی حالات اور بعدازاں انسانی ذوقِ جمال نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

مندرجہ بالا معروضات سے ثابت ہوتا ہے کہ لباس کوئی الوہی اور فطری چیز نہیں، بلکہ خاص حالات میں ضرورتوں کے تحت انسان کی اپنی ایجاد کردہ چیز ہے۔ لباس کے ساتھ شرم وحیا اور پردے کے تصورات بہت بعد میں مخصوص سماجی حالات میں پیدا ہوئے۔ آج ہم کسی بھی لباس کو جس شکل میں دیکھتے ہیں، وہ بذاتِ خود کئی سو سال کے ارتقائی عمل کے دوران مختلف تبدیلیوں سے گزر کر موجودہ شکل میں پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ گویا لباس نہ تو ہمیشہ سے تھا، اور نہ ہی دیگر اشیا کی طرح یہ کبھی تغیر وتبدل کے عمل سے ماورا رہا ہے۔ تمام قوموں کے لباس مختلف تاریخی ادوار میں تبدیل ہوتے رہے ہیں۔

کوئی قوم ارتقائی سفر میں تاریخ کے کون سے مقام پر کھڑی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے دیکھا جاسکتا ہے کہ اس کی لباس کے بارے میں سوچ اور رویہ کیا ہے۔ پسماندہ قومیں پرانے روایتی لباس کے ساتھ جذباتی لگاؤ رکھتی ہیں، اور اپنے اس لباس کو باعثِ فخر سمجھتی یا اسے اپنی قومی شناخت سے تعبیر کرتی ہیں۔ سست روقبائلی اور فیوڈل نظام انسان کو صدیوں ایک ہی جگہ اور ایک ہی حالت میں کھڑے رکھتے ہیں، چنانچہ پسماندہ معیشت کے عوام اپنے لباس کو بھی ناقابلِ تغیر خیال کرنے لگ جاتے ہیں۔ آج کے سائنسی دور میں نہ صرف دنیا تیزی سے سمٹ رہی ہے، بلکہ نہایت سرعت کے ساتھ انقلاب انگیز تبدیلیوں کا شکار ہے؟ مختلف اقوام کی ضروریات، تقاضے اور خصوصیات جو پہلے تھیں، وہ سب تبدیل ہو کر ایک ہی جیسے یونیورسل صنعتی معاشرے کی طرز زندگی میں ڈھلتی جارہی ہیں۔ تعلیم، سائنس اور ترقی یافتہ صنعتی ماحول انسان کی فکر

ونظر کو صدیوں کے زنگ آلود شکنجے سے آزاد کرتے ہیں اور اسے محدودیت سے لامحدودیت، غلامی سے آزادی، کوتاہ بینی سے وسعت نظری کی طرف لے جاتے ہیں۔ موسموں پر انسان کا اپنا کنٹرول ہو گیا ہے۔ وہ گرمی کو سردی اور سردی کو گرمی یا جیسا چاہے بدل کر رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ لباس کس طرح کا ہو، اس کا سراسر تعلق اب انسان کی اپنی ضرورت اور ذوق سے ہے۔

پسماندہ معیشت محدود اشیائے پیداوار کی حامل ہوتی ہے۔ مدتوں اور نسلوں ایک ہی طرح کی چیزوں کا استعمال ہوتا رہتا ہے۔ پرانے وقتوں میں اس کی سماجی اور جغرافیائی ضرورت تھی۔ اگرچہ آج سماجی حالات تبدیل ہو چکے ہیں، لیکن بند ذہنوں کا مسئلہ ابھی تک قائم ہے۔ اپنے معاشرے کو لیجئے، خاص طور پر ہماری شہری عورت کے لیے شلوار قمیض کے سوا اور کسی طرح کے پہناوے کی کوئی شکل رائج نہیں۔ وہ بیچاری اسی کو کبھی لمبا، کبھی چھوٹا، کبھی کھلا، کبھی تنگ کرتی رہتی ہے۔ اسے ورزش کرنی ہو، وہ اتھلیٹ یا کھلاڑی ہو، یا جدید دور کے پروفیشن میں کام کر رہی ہو، اسے اپنے پہناوے میں کوئی ریڈیکل تبدیلی لانے کا حوصلہ نہیں، خواہ روایتی لباس اس کی کارکردگی کا ستیاناس ہی کیوں نہ کر رہا ہو، کیونکہ اسے سماج میں ایک آزاد فرد کی حیثیت حاصل نہیں، وہ قدامت پرست مردانہ سماج کی دست نگر زندگی گزار رہی ہے۔ ہمارا محنت کش طبقہ شدید گرمی کی حالت میں بھی کئی گز کپڑے پر مشتمل شلوار قمیض اپنے جسم پر لپیٹے پسینے سے شرابور کام کر رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنے جسم کے لباس کو اس لیے مختصر نہیں کرتا کہ کہیں سماج کا اخلاق خطرے میں نہ پڑ جائے۔ گویا لباس انسان کے لیے نہیں، انسان لباس کے لیے ہے! اسے اس میں اپنی ضرورت کے مطابق کانٹ چھانٹ کرنے کی اجازت نہیں۔ ادھر جدید صنعتی دور نے اشیائے صرف کی پیداوار میں بے حد تنوّع اور اضافہ کر دیا ہے۔ پہلے زمانے میں آدمی کے پاس انتخاب نہایت محدود تھا، ہزاروں سال ایک ہی طرح کا لباس پہننا اس کی مجبوری تھی، جب کہ آج ہمارے سامنے ورائٹی کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ انسان اپنے دائرۂ کار کو محض طبعی ضرورتوں کی تسکین تک محدود نہیں رکھتا، وہ اس میں حسن، ذوق اور تخلیقی اپج بھی پیدا کرتا ہے، لہٰذا ایک ہی طرح کا لباس پہننا آج کے انسانی مقام اور زمانے سے میل نہیں کھاتا۔ لباس کے معاملے میں بھی ہماری فکر کی تصحیح کی ضرورت ہے۔ بنیادی بات ہے کہ لباس انسان کے لیے ہے، انسان لباس کے لیے نہیں۔ انسان کو اتنا چھوٹا نہ کیا جائے کہ جونہی کسی نے روایتی وضع کے لباس سے انحراف کیا، معاشرے میں ہلچل مچ گئی۔ اس طرح کے رویے کا مطلب ہے کہ انسان اشرف المخلوقات تو کجا، خود اپنے بنائے بے جان کپڑے کا غلام ہے؛ اسے تو اپنے لباس کی وضع قطع تک کو تبدیل کرنے کی اجازت نہیں۔ لباس کے چناؤ میں انسان کو لباس پر بالادستی ہونی چاہیے نہ کہ لباس کو انسان پر۔

کم از کم ہمارے معاشرے کی عورت اپنے روایتی لبادے میں تبدیلی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ خواہ کوئی بھی موقع ہو، کام کی نوعیت کچھ بھی ہو، کھیل کود میں شریک ہونا ہو، ورزش کرنی ہو، جنس کا موسم ہو، اسے ہر صورت شلوار قمیص کے اندر ہی رہنا ہے۔ (اب اپر اور مڈل کلاس کی کم عمر اور نوجوان لڑکیوں کی نہایت قلیل تعداد پاجامہ اور پینٹ پہننے لگی ہیں، لیکن جونہی شادی کی عمر میں پہنچتی ہیں، ان کی یہ آزادی بھی ختم ہو جاتی ہے۔) بدن اس معاشرے کی سب سے بڑی ذہنی کمزوری ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہ ہر وقت ایمان، تقویٰ اور شرم وحیا کے چکر میں رہتے ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ صنفِ مخالف کے جسم کا برہنہ حصہ تو دور کی بات ہے، بدن کے ملبوس اتار چڑھاؤ بھی ان کے ذہن کو منتشر (explode) کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ ان کی جنسی خواہش مشتعل اور ایمان متزلزل ہونے میں ذرا دیر نہیں لگتی! چنانچہ ایمان کو خراب کرنے والی عورت کے اس بدن کا ایک ہی حل ہے کہ اسے چار دیواری میں بند کر کے اس کی موجودگی کو معاشرے سے غائب کر دیا جائے، یا پھر اسے بہت سے کپڑوں میں لپیٹ دیا جائے۔

شلوار قمیض جدید زندگی کے کئی کاموں کے لیے مناسب لباس نہیں اور پہننے والے کی کارکردگی پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ چادر یا دوپٹہ تو کوئی کام چستی اور ہوشیاری سے کرنے ہی نہیں دے سکتا۔ شلوار قمیض کی بطور لباس پھر بھی سمجھ آتی ہے، قمیض نے بالائی حصہ ڈھانپ لیا، شلوار نے نیچے کا، لیکن اس کی سمجھ نہیں آتی کہ ایک طرف کندھے پر رکھے یا گردن کے گرد لپٹے لمبے سے باریک کپڑے کے ٹکڑے کا کیا کام ہے، اور وہ نسوانی لباس کا لازمی جزو کیوں کر ہے؟ جبکہ یہ کسی حصے کو ڈھانپتا بھی نہیں ہے، لیکن اس زائد از ضرورت اور عملی

لحاظ سے رکاوٹ کا سبب بننے والے فالتو کپڑے کے اس ٹکڑے کو ہماری عورت چھوڑنے کا سوچ نہیں رہی، خواہ وہ پڑھی لکھی ہو یا ان پڑھ، گھریلو عورت ہو یا ملازمت کرنے والی۔ نہ صرف دوپٹہ نام کے کپڑے کا بظاہر کوئی مقصد نہیں، بلکہ اس کو ہر دم سنبھالے رکھنا پڑتا ہے، عورت کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے اٹھا کر درست کرنا ہوتا ہے، اکثر اس کا سرا کہیں نہ کہیں پھنسا یا گرا ہوا ہوتا ہے، گویا عورت کے لیے وبالِ جان (nuisance) سے کم نہیں۔ شعوری اور لاشعوری طور پر اس کی توجہ ہر وقت دوپٹے کی طرف رہتی ہے۔ ایک ایسی چیز کے سنبھالنے میں عورت کی خاصی توانائی صرف ہو جاتی ہے جس کی نہ کوئی افادیت ہے، اور نہ اس کا کوئی فنکشن ہے۔ ایک عورت جو چادر لیتی ہے، اس کا مقصد پھر بھی سمجھ میں آتا ہے، لیکن دوپٹہ سمجھ سے باہر ہے، سوائے اس کے کہ عورت کو آزاد (liberate) نہ ہونے دیا جائے، اس کا شعور، توجہ، دست و بازو ہر وقت بندھے رہنے چاہئیں۔ ہماری عورت نے لباس کے اس انتہائی فالتو جز کو اتنی تابعداری سے سنبھال رکھا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ عورت کی اب عادت بھی بن چکا ہے۔ اس کے بغیر اب عورت اپنے لباس کو نامکمل سمجھتی ہے، دوپٹہ اس کا ساتھی ہے، اسے سلامتی کا احساس دیتا ہے، (پہلے خود ہی عدم سلامتی کا احساس پیدا کیا جاتا ہے)۔ اگر اسے کوئی عورت اب اتار بھی دے، تو مرد تو شاید اس کا نوٹس لیں یا نہ لیں، لیکن عورتیں ہی اس کا جینا اجیرن کر دیتی ہیں — ہائے تم نے دوپٹہ نہیں لیا؟ پوچھا جا سکتا ہے کہ تم نے کیوں لیا ہوا ہے؟ آخر اس کا مطلب تو بتا دو۔ مطلب بس یہی ہو سکتا ہے کہ ہم تو پھنسے ہوئے ہیں، تو تم کس طرح آزاد ہو رہی ہو۔ گویا دوپٹہ کوئی لباس نہیں ہے، یہ محض علامت ہے، عورت کو زنجیر پا کرنے کی، اسے کمزور کرنے کی، کہ ہر وقت عزت اور نسوانیت کے نام پر ایک فالتو کپڑے کے ٹکڑے کو سنبھالے رکھو، تم اسی لائق ہو، تمھیں یک سُو ہو کر کوئی بامقصد اور تعمیری کام کرنے کی کیا حاجت ہے۔ عورت کی توجہ بٹی رہے، اور اسے فرد کی بجائے صنف کشش ہونے کا احساس ہوتا رہے۔ اگر دوپٹہ کا مقصد چھاتی کے حصے کو ڈھانپنا ہے، تو آج عملاً ایسا نہیں کیا جاتا، یہ ایک طرف لٹکا ہوتا ہے، چھاتی تو دونوں طرف ہوتی ہے، یا گلے میں لپٹا ہوتا ہے۔ نہ جانے ہم خود کو کیوں سیکس زدہ کرتے رہتے ہیں؟ پہلے سے ہی اپنے ذہنوں کو خراب کر کے کیوں چلتے ہیں؟ روزمرہ اور معمول کے حالات میں نارمل انسان کیوں نہیں رہ سکتے؟ مہذب معاشروں کے افراد عام حالات میں اور روزمرہ کام کاج کے دوران صنفی اور جنسی لحاظ سے نہیں سوچتے۔ مرد و زن مخلوط ماحول میں اپنے اپنے کام سرانجام دے رہے ہوتے ہیں، وہ عورت اور مرد نہیں افراد ہوتے ہیں۔ ان کی پرائیویٹ زندگی چاہے کتنی ہی سیکس زدہ کیوں نہ ہو، اس کا اثر کام کے ماحول پر نہیں پڑنے دیا جاتا۔ ہماری سوچ ہی جنس سے شروع ہوتی ہے۔ خواہ ماں ہو، بہن ہو، یا بیٹی ہو، ہم سب سے پہلے اسے جنسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تبھی تو اسے پردہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اگر فرد سمجھیں تو اسے فالتو کپڑوں میں لپٹنے کا حکم کبھی نہ دیں۔ یہ بھی بات غلط ہے کہ آپ اوروں کی نظروں سے بچانے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ کی اپنی نظر خراب ہوتی ہے۔ گھر سے باہر گلیوں، بازاروں اور دفاتر میں مرد آسمان سے تو نہیں اترے ہوتے۔ آپ ہی وہ مرد ہوتے ہیں جو گھر میں کسی کے باپ، بھائی اور بیٹے ہوتے ہیں۔ پردہ مرد کی ذہنی گندگی اور منافقت کے سوا کچھ نہیں۔

آج دنیا سمٹ رہی ہے، اس کے رہنے سہنے کے انداز ایک سے ہو رہے ہیں، لہٰذا قوموں کے اپنے اپنے لباس بھی نہیں رہیں گے۔ یہ انسان کے انتخاب، پسند اور ضرورت پر ہوگا کہ وہ کس طرح کا لباس پہنے۔ تمام روایتی لباس سست روی کی علامت اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں، اس لیے کہ وہ قبائلی اور فیوڈل دور کے لباس ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق کی جس قوم نے بھی ترقی کی طرف قدم بڑھایا ہے، اس نے اپنا لباس بھی مغربی طرز کا کیا ہے۔ جاپان اور چین اس تبدیلی کی واضح مثالیں ہیں۔ آج کے جدید مشینی، دفتری اور گھریلو ماحول میں جس ذہنی اور جسمانی چستی کی ضرورت ہے، روایتی ڈھیلا ڈھالا لباس اس چستی اور ہوشیاری کو نہیں لا سکتا۔ روایتی لباس کے ساتھ ہمارا جذباتی رشتہ نفسیاتی معاملہ ہے۔ جو کام صدیوں سے ہو رہا ہے، لگتا ہے کہ زندگی کا اس کے بغیر تصور ہی ناممکن ہے۔ ہمیشہ سے برقع پوش عورت کے لیے برقع اتارنا برہنہ ہونے سے کم نہیں ہوتا۔ ایسے ہی جب کسی عورت نے کبھی برقع نہ پہنا ہو، اس کے لیے اسے ایک لمحے کے لیے برداشت کرنا مشکل ہے۔ قومی مزاج بھی ایسے ہی بنتے ہیں۔ صدیوں سے موجود نظریات، رسم و رواج اور اشیا تقدیس کا درجہ لے لیتی ہیں، اور ان کے بغیر اپنے وجود کا تصور ناممکن نظر آتا ہے۔ لیکن ہر آن بدلتا وقت پرانی چیزوں کے لیے بڑا بے رحم ہوتا ہے۔ نئے نظریات زیادہ بارآور، خوب صورت اور قوت خیز ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں حکمراں طبقہ بھی عوام کو بے وقوف بنانے سے نہیں چوکتا۔ اسے عوام کی ترقی اور اس ملک کی خوشحالی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حکمران شلوار قمیض پہننے سے ''عوامی'' نہیں ہو جاتا، اس کا کردار اسے عوامی بناتا ہے، جب کہ حکمران کردار کو معیار بنانا نہیں چاہتے، محض بے مقصد علامتوں میں عوام کو مدہوش رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے حکمران خود اپنی ذاتی زندگی خوب عیش و عشرت اور جدید دور کے تمام مزے لوٹتے ہوئے گزارتے ہیں، لیکن خواہش رکھتے ہیں کہ عوام میں ترقی کا شعور نہ آنے پائے، وہ فیوڈل دور کی اقدار میں ہی پھنسے رہیں۔ چنانچہ ریاستی میڈیا انھی اقدار کی شان بڑھانے (glorifcation) میں لگا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دفتروں میں جائیں، تعلیمی اداروں میں چلے جائیں، سب سٹاف ''ماجھا گاما'' ٹائپ کے لباس میں ہوگا، چست، بیدار اور نارمل کام کا ماحول ہی نہیں ملے گا۔ سٹاف کی تن آسانی، ڈیوٹی پر آنے کے لیے کسی لباس کی تبدیلی کی ضرورت نہیں، بیڈ روم سے سیدھے دفتر اور اسکول کالج آ سکتے ہیں۔ شلوار قمیض میں ملبوس سکولوں کے بچے مزدوروں کی پلٹن دکھائی دیتے ہیں۔ رسمی اور غیر رسمی لباس کی تمیز ہی ختم کر دی گئی ہے۔ زندگی کو فری اسٹائل بنا دیا گیا ہے۔ ان چیزوں کے مضر اثرات نظر نہیں آتے، لیکن قوموں کا ستیاناس ہو رہا ہوتا ہے۔ کیا سماجی مفکروں کے لیے یہ غور و فکر کا مقام نہیں ہے کہ ہماری قوم ایک ایسے لباس کے عشق میں مبتلا ہے جو پہننے کے فوری بعد سلوٹیں پڑنے سے خراب اور گندہ محسوس ہونے لگتا ہے اور چند گھڑی کے پہناوے کے بعد اسے دوبارہ استری کیے اور دھوئے بغیر پہنا نہیں جا سکتا، جو ہمیں سمارٹ اور چست ہونے سے روکتا ہے، جس کی لمبائی چوڑائی پر فضول اور فالتو کپڑا استعمال ہوتا ہے۔

لباس انسان کی کبھی ضرورت تھا، لیکن آج کا انسان اسے من کی خوشی کی خاطر پہنتا ہے۔ اسی لیے فیشن کا جنم ہوا۔ انسان خوبصورت ہے، اس کا جسم خوبصورت ہے، اور اسے اپنے وجود کی خوبصورتی پر خوش ہونے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اس سے زندگی میں طاقت اور قوت پیدا ہوتی ہے اور انسان فطرت کی تسخیر میں اور زوردار طریقے سے جت جاتا ہے۔ اگر اسے اپنی زندگی سے خوشی کشید کرنے کی اجازت ہی نہیں ہوگی تو وہ مجبوراً زندہ رہنے کے سوا کچھ نہیں کرے گا۔ قیود و حدود انسانی فطرت اور روح کے منافی عمل ہیں۔ وہ جسے اچھا سمجھے کرے۔ انسان کی خوشیوں پر بے کار پابندیاں نہیں لگائی جا سکتیں، ورنہ وہ انسانی نہیں مردہ معاشرہ ہوگا۔ اس سے خود ساختہ اخلاقیات تو بچ جائیں گی، لیکن انسان مر جائے گا۔ معیارِ زندگی کو تبدیل ہونے دیں، یہی زندہ ہونے کی نشانی ہے۔ بات عریانی کی نہیں، ذہن کی آزادی کی ہے، خود پر اعتماد کی ہے۔ اپنے ہی جسم (body) کو گناہ آلود اور باعث شرم سمجھنا، اپنے وجود کی تذلیل اور فطرت کی تحقیر کرنا ہے۔ ہمیں حسن سے لطف اندوز ہونے کی حس قدرت نے دی ہے، اور اس کی نفی زندگی کی نفی ہے۔

لباس کا سوال گہرے طور پر ذہن کی آزادی سے جڑا ہوا ہے۔ ترقی کی راہ میں گامزن ہر قوم نے لباس کے معاملے میں بھی اپنے ذہن کو آزاد چھوڑا ہے۔ صرف لباس کے بارے میں ہمارے رویے کی تبدیلی ہماری نظری، فکری اور عملی زندگی میں خوشگوار اور کشادہ احساسات کے دریچے کھول دے گی۔ اگر ہم ذہنی طور پر ہی آزاد نہیں، اپنی خوشیوں کی راہ میں ہر طرف خود ہی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں تو بند ذہنوں کے ساتھ کائنات کے چیلنج کو بھی قبول نہیں کر سکتے۔ جن قوموں نے اپنے ذہنوں کو آزاد کیا ہے، نئی سے نئی منزلیں ان کا مقدر ہیں، اور ہم جیسی قومیں جو روایتی لباس کے سرابی تفاخر سے ہی بہل جاتی ہیں، ان کی صورت اور حشر ہمارے جیسا ہی ہوتا ہے . . .

جنس اور سماج

اس زمین پر زندگی کا آغاز تقریباً تین ارب سال قبل ہوا۔ ان میں ابتدائی دو ارب سال تک حیات (organism) کی افزائش خلیے کے از خود منقسم ہونے سے ہوتی رہی۔ اس طریقے سے ہو بہو پہلے جیسی اکائی پھر سے جنم لے لیتی۔ اس طویل عرصے کے دوران ارتقا بے حد سست رہا جس کی وجہ سے نئی اشکال اور دیگر نوعی تبدیلیاں بہت کم وقوع پذیر ہوئیں۔ سبز کائی حیات کی وہ پہلی شکل تھی جس نے ایک ارب سال قبل بذریعۂ جنس (sex) اپنی افزائش کو شروع کیا۔ چنانچہ جنسی طریقۂ افزائش سب سے پہلے پودوں، پھر حیوانات سے ہوتا ہوا انسانی دنیا کا معمول بن گیا۔ انواع کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر افزائشِ نسل (breeding) نہیں کر سکتے۔ جنسی طریقۂ افزائش سے حیاتیاتی اشکال میں بے حد تنوع پیدا ہوا اور ارتقا کے نہ ختم ہونے والے عمل کو دھکا مل گیا۔ اس عمل سے حیات کی ہر وحدت اپنی نوع کے اندر رہتے ہوئے انفرادیت کو قائم رکھتی ہے۔ جنس فطرت کے انتخابی نظام (natural selection) کی تشکیل کرتی ہے، جس کے نتیجے میں موزوں ترین کی بقا (survival of the fittest) کا نظام عمل میں آتا ہے۔ نیرنگیِ حیات کا سارا دارومدار گونا گونی میں مضمر ہے۔ تنوع کا عمل ارتقا کے ساتھ مزید تفاوت پیدا کرتا گیا۔

انسانی نوع میں جنس بے حد ترقی یافتہ شکل میں پائی جاتی ہے اور اس کا بہت ہی خصوصی کردار ہے۔ اس کی مادہ کسی خاص وقت یا موسم کی محتاج نہیں ہوتی اور وہ افزائش کے جنسی عمل میں پوری سرگرمی سے شرکت کرتی ہے۔ مخلوقات کی متنوع دنیا میں صرف انسانی نوع میں مادہ کو شہوتی ہیجان (orgasm) حاصل ہے۔ گوریلا نر اپنی مادہ کے وزن سے دوگنا ہوتا ہے۔ گوریلا اور چمپینزی کے نر اور مادہ کے درمیان بہت زیادہ فرق ہوتا ہے، جب کہ مرد اور عورت کے درمیان جنسی اور حیاتیاتی رویوں میں بہت کم فرق ہے۔ مخلوقات میں صرف انسان ہیں جو آمنے سامنے ملاپ کرتے ہیں؛ یہ مرد و زن کے درمیان عمومی مساوی حیثیت کا فطری اظہار بھی ہے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ انسان فطری طور پر یک زوج (monogamous) ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مرد و زن ایک سے زیادہ کے ساتھ جنسی ربط کی فطری طور پر خواہش رکھتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام سماج اس کے لیے مختلف ضوابط تشکیل دیتے رہے ہیں۔ قدیم مذاہب میں جنس کے ساتھ گناہ کا کوئی تصور نہیں تھا، بلکہ جنسی اختلاط کو مقدس رسم کے طور پر مندروں میں ادا کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان کو سب سے زیادہ فطری قوتوں کے ساتھ مقابلے میں ماورائی قوتوں کی مدد حاصل کی جائے۔ اپنی یقینی بارآوری اور ان پودوں اور حیوانوں کی یقینی افزائش انسان کی سب سے بڑی پریشانی تھی جو اس کے لیے خوراک مہیا کرتے تھے، خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں خوراک کی فراہمی غیر یقینی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں جنسی فعل اور پوجا پاٹ آپس میں خلط ملط ہو گئے، تاکہ جنسی (تخلیقی) فعل میں خدائی قوتوں کو شامل کر کے اپنی بقا کو یقینی بنایا جا سکے۔ کئی مذاہب کے دیوتا (gods) خود جنسی طور پر فعال زندگی گزارتے رہے ہیں۔ جنس کے ساتھ گندے پن اور گناہ کا احساس ہمیں بہت بعد میں آج کے مقبول عام مذاہب (اسلام، عیسائیت اور یہودیت) میں ملتا ہے، جنھوں نے عمومی طور پر جنس دشمن (anti-sex) رویے کا اظہار کیا۔ انھوں نے تخلیقِ انسان کے بارے میں جو کہانیاں بیان کیں ان میں جنسی عمل کو حیران کن طور پر دبا دیا گیا ہے اور اسے افزائش کے لیے ضروری عمل قرار نہیں دیا گیا۔ حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا جاتا ہے، کنواری عورت کے ہاں بچے کی ولادت کروادی جاتی ہے! عیسائی بہشت میں جنس ناپید ہے اور جنسی میلانات کو شیطانیت سے منسوب کیا گیا ہے۔

سماجی سطح پر کون سا فعل جنسی قرار پائے گا، اس کا انحصار اس فعل کے سیاق و سباق کو دیکھ کر طے کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بوسہ غیر جنسی محبت، احترام اور سماجی سلام دعا کی علامت بھی ہو سکتا ہے۔ انسانوں میں جنس کے فرق کا شعور بچپن سے ہی پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بچے اپنے جنسی اعضا کا معائنہ متجسس نظروں سے کرتے ہیں اور ان سے چھیڑ چھاڑ کر کے لذت محسوس کرتے ہیں۔ بچے کو جلد سمجھ آ جاتی ہے کہ سوائے جنسی اعضا والے حصوں کے وہ اپنے اور کسی اور دوسرے کے جسم کے کسی بھی حصے کو چھو سکتا ہے۔ بچہ معصومیت سے جونہی جنسی اعضا کو

ہاتھ لگاتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ بڑے فوراً متوجہ ہوتے ہیں اور سرزنش کرتے ہیں یا اس کی توجہ کو دوسری طرف ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے بچے پر یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس حصے میں کوئی خاص بات ضرور ہے اور یہ حصہ سماجی لحاظ سے ممنوع (taboo) ہے۔ جب وہ اپنے شباب کی عمر کو پہنچتے ہیں تو والدین اور سماج آسانی سے تسلیم نہیں کرتے کہ اب بچے جنسی صلاحیتوں کے حامل ہو گئے ہیں اور جنسی احساسات انھیں متاثر کر رہے ہیں۔ بچے کو بتایا جاتا ہے کہ وہ جنسی عمل سے اجتناب کرے۔ نوجوان لڑکیوں کو حمل، جنسی بیماریوں اور ''بے عزت'' ہونے سے ڈرایا جاتا ہے۔ مذہب اس میں گناہ کے تصور کو بھی شامل کر دیتا ہے۔ ہمارے جیسے معاشروں میں مرد اور عورت کے لیے مختلف اخلاقی پیمانے استعمال ہوتے ہیں۔ جنسی تفریق اور اخلاقیات کے اس دوہرے معیار کی وجہ سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان رفاقت کے فطری رشتے کی بجائے خوف، تشکیک اور کمزور بمقابلہ طاقتور کا تعلق استوار ہو جاتا ہے جہاں بالغ مرد کی خواہش، دعا اور کوشش ہوتی ہے کہ کاش کسی نہ کسی طریقے سے کوئی لڑکی یا عورت ''پھنس'' جائے۔ صنف مخالف اس کے پھینکے ہوئے جال سے بچے رہنے میں اپنی عافیت سمجھتی ہے۔ چنانچہ باہمی تفہیم اور احترام کا رشتہ استوار ہونے کی بجائے ایک ایسی کشمکش کا نقشہ بنتا ہے جس میں لڑکی مزاحمت کار اور مرد ایک جارح اور بہکانے والے کا کردار ادا کرتا ہے۔ مردانہ امیج کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مقابلے میں اپنی کامیابی کو ثابت کرے۔ اس طرح کا افسوس ناک رشتہ عورتوں کے رویے پر بڑے دُور رس منفی نتائج مرتب کرتا ہے۔ اس کا مردوں پر اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ اور مردوں کی عورت کے ساتھ بنیادی دلچسپی صرف جنس (sex) تک محدود ہو جاتی ہے۔ عورت مرد کے سامنے مسکرانے یا اس کے ساتھ دوستانہ رویے میں پیش آنے سے اجتناب کرتی ہے کہ کہیں مرد اس کا کہیں غلط مطلب ہی نہ لے لے۔ گویا اپنے اس معاشرہ کا سائنسی تجزیہ کرنا نہایت ضروری ہے، جس نے اخلاقیات یا مذہب کے نام پر فطرت کے بنائے ہوئے صنفی رشتوں میں نہ صرف بگاڑ پیدا کیا ہے، بلکہ انھیں گھٹیا سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔

شکوک، عناد اور اضطراب کی ایسی فضا میں مرد و زن کے بیچ میں اعتبار اور گرم جوشی پر مبنی صحت مندانہ تعلقات جنم نہیں لیتے۔ اگرچہ محبت (love) کی طاقت ور جبلت اس طرح کے منفی رشتے کو کم ضرور کرتی ہے، خاص طور پر مردوں میں، لیکن عورت پھر بھی دفاعی اور شکی روّیہ بر قرار رکھتی ہے۔ استرداد، استحصال اور دل شکنی کے مذکورہ بالا عوامل موجودگی میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ہمارے معاشرے میں جنس کے بارے میں ایک صحت منداور عقلی (rational) رویہ قائم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے سماج میں لڑکا ہو یا لڑکی دونوں مسخ شدہ جنسی رویے اور دبی ہوئی شخصیتوں کے ساتھ بلوغت کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں۔ نوجوان جوڑے میں جنسی خواہش چوں کہ شدید اور مسلسل ہوتی ہے، اس لیے بار بار کے جنسی عمل کے بعد ہی نو بیاہتا جوڑا شرم اور گناہ کے ابتدائی احساس پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ سماج کی جنسی ملاپ پر غیر ضروری پابندیاں ''چاہے جانے'' کی فطری جبلت کے آگے خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہیں۔ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو اس بات کی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ اسے چاہا جائے۔ اور محبت کے زیرِ اثر جنسی ملاپ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ آپ پرکشش، چاہت کے قابل اور لائقِ عزت ہیں اور یہی ثبوت ہر دو جانب فریق کی عزتِ نفس اور خوشی کے لیے لازم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہایت گھٹن اور پابندیوں کے ماحول میں پلے ہوئے افراد بھی محبت کے اس طاقت ور محرک کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے کے سپرد کر دیتے ہیں اور بسا اوقات سماجی پابندیوں کی پروا بھی نہیں کرتے۔

امریکی ماہر بشریات جی پی مدوک سماجی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے جنسی مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس مسئلے کا سامنا تمام معاشروں کو کرنا پڑا ہے کہ جنس پر کنٹرول بھی کیا جائے اور اس کی مناسب حد تک چھوٹ بھی دی جائے، چنانچہ اس کے حل میں بھی سبھی سماجوں نے حدود اور ممانعتوں کے ساتھ کچھ اجازتیں بھی دے رکھی ہیں، تاکہ معاشرے کو انتشار زدہ جنسی دوڑ سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اجازتی ضوابط ایسے ضرور رکھے جاتے ہیں جس سے فرد کی کم سے کم جنسی ضرورت کی تسکین بہر حال ممکن ہو سکے۔

جنسی ضوابط کا تاریخی پس منظر:

قوموں کے جنسی رویوں پر نظر ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے تاریخی ورثے کا مطالعہ کیا جائے۔ اپنی سماجی تنظیم، فلسفے اور قانون کے لحاظ سے مغربی تہذیب کی جڑیں بنیادی طور پر یونان اور روم میں پیوست ہیں، جس پر یہودیت اور عیسائیت کی گہری چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ اس تاریخی ملغوبے میں متضاد عناصر شامل ہیں۔ وہاں شخصی آزادی کا بے حد احترام تھا لیکن قانون اور مناسب طریقے پر بھی بہت زور دیا جاتا تھا۔ جہاں روم اور یونان کی اصنام پرستی کا ٹکراؤ یہودی و عیسائی وحدانی تصورِ خدا سے ہوا وہاں یونانیوں کی جنسی مباحت (permissiveness) کا تضاد ابتدائی عیسائیت کی مجنونانہ جنس دشمنی کے ساتھ پیدا ہوا۔ رہبانیت کے تصور کا ارتقا اس خیال کی پیداوار تھا کہ اس نفس پرستانہ مادی دنیا کے مقابلے میں ایک روحانی دنیا ہے جو اچھی ہے، چنانچہ گوشت پوست کے اس جسم اور روح کے درمیان مسلسل کشمکش چلتی رہتی ہے۔ چونکہ جنسی فعل کا تعلق جسمانی لذت کے ساتھ ہے، لہٰذا یہ بھی روح کی دشمن ہے۔ یہودیت بھی جسم اور روح کی مذکورہ تقسیم کی قائل تھی۔ اسی طرح ابتدائی عیسائی دور میں شادی سے باہر جنسی بندھن ناقابلِ تصور تھا۔ شادی بھی محض افزائش کی خاطر ایک بدبخت ضرورت تھی نہ کہ ذریعۂ لذت۔ عیسائیت میں نہ تو خدا کی کوئی بیوی ہے نہ اس کے نبی کی، اور ان کی جنت میں بھی جنسی زندگی کا تصور نہیں ملتا۔ عیسوی مذہب میں جنس دشمنی کا سبب ان کا وہ الہامی نظریہ تھا جس کے مطابق قیامت نزدیک تھی اور انسان کی اس مادی دنیا سے خلاصی جلد ہی ہونے والی تھی۔ لیکن بعد ازاں جب یہ احساس ابھرا کہ ابھی انسان نامعلوم مدت تک اس دھرتی پر زندہ رہنے والا ہے، تب جنسی ضوابط میں نرمی کی گئی۔ روح اور مادے کے درمیان تفریق اور روح کی برتری کا تصور صرف یہودی اور عیسائی مذہب کا خاصہ ہی نہیں، اس نظریے سے دیگر مذاہب بھی متاثر ہیں۔ اسلام کے اندر بھی یہی عقیدہ پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔

جس طرح یہودی اور عیسائی مذہب جنسی گناہ اور اس کی طرف ترغیب کا سارا بوجھ عورت کے کندھے پر ڈال دیتے ہیں، اسلامی شریعت کے مطابق بھی عورت روحانی طور پر ایک کمزور مخلوق ہے جو شہوانی جذبے کے آگے آسانی سے گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ وہ حوا کی طرح مرد کو گناہ کی طرف مائل کرتی ہے۔ اس طرح مردوں نے مذاہب کی آڑ میں اپنی گناہ آلودہ خواہشوں کو عورت کے کھاتے میں ڈال کر خود کو بری کر لیا! اگرچہ آج کی دنیا میں تھیاکریسی کا خاتمہ ہو چکا ہے اور قانونی کنٹرول مذہبی پیشوائیت سے ریاست کو منتقل ہو چکا ہے، لیکن ہمارے موقع پرست حکمرانوں کی وجہ سے مذہبی پیشوائیت کو ماورائے قانون سماجی ضوابط پر اب بھی طاقتور کنٹرول حاصل ہے۔ بعض معاملات میں ملاؤں کی شریعت ریاستی قوانین سے زیادہ موثر ہو جاتی ہے۔ اب تو حالت یہ ہو گئی ہے کہ ریاست کی بنائی ہوئی سیکولر عدالتوں میں جج صاحبان نے شریعتی بنیاد پر فیصلے سنانے شروع کر دیے ہیں، جو انسانی حقوق اور سول سوسائٹی کے مروجہ اور ان عالمی معیاروں کے صریحاً خلاف ہوتے ہیں جن پر ہماری ریاست نے دستخط کر رکھے ہیں تاکہ دنیا ہمیں وحشی اقوام میں شریک نہ سمجھے۔ جیسے غیرت کے نام پر عورت کے قتل کو جائز قرار دینا یا پھر شادی کے لیے مرد سرپرست (ولی) کی اجازت کو ضروری قرار دینا وغیرہ۔ مغرب میں مذہب سماجی کنٹرول کے میکانزم کی حیثیت سے خاصا کمزور ہو چکا ہے۔ وہاں جنس اور اس پر پابندیوں سے متعلق قوانین کافی حد تک نرم ہو چکے ہیں۔ مغرب کی دنیا میں جنس اب گناہ نہیں فطرت کی دی ہوئی صلاحیت ہے جسے تعمیری انداز سے استعمال کیا جا سکتا ہے، جب کہ ہمارے جیسے پسماندہ مشرقی سماجوں میں مذہب کے زیرِ اثر جنس آج بھی پراگندہ اور گناہ آلودہ فعل ہے۔

(الف) شادی:

جب شادی کا ادارہ وجود نہیں رکھتا تھا، تب جنسی ملاپ کے لیے کھلی مقابلے بازی تھی۔ شادی کے ادارے نے مرد اور عورت کے لیے نہ صرف جنسی ساتھی کو یقینی بنایا، بلکہ انھیں ذہنی فرصت بخشی کہ وہ اپنی توانائی اور وقت کو جنسی تسکین کی تلاش میں صرف کرنے کی بجائے انھیں زندگی کے دوسرے مفید معاملات میں لگا سکیں۔ ورنہ شادی کے ادارے سے قبل بزرگ حضرات اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے خاندان کی جوان لڑکیوں پر

قبضہ کر لیتے تھے اور اپنے نوجوانوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ جنسی ساتھی کے طور پر بیرونی قبائل کی عورتوں پر ہاتھ صاف کریں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ شادی کا ادارہ محض بچوں کی نگہداشت کے لیے نہیں بنا تھا، کیونکہ اس کے لیے متبادل انتظامات بھی ہو سکتے ہیں۔

(ب) بالجبر جنسی تعلقات پر کنٹرول:

کسی کے ساتھ بالجبر جنسی فعل کرنے کو اس لیے ممنوعہ قرار دیا گیا تا کہ متاثرہ فریق کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے غصے اور انتقام سے بچا جائے اور شاید اس لیے بھی کہ جبری جنسی رشتے سے پیدا ہونے والے بچے کے امکان کو ختم کیا جا سکے۔

(ج) خونی رشتوں کے درمیان ممانعت:

تمام معاشروں نے محرمات سے مباشرت کو ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ قدیم لوگ جدید سائنس کے علم جینیات کے اس انکشاف سے اگرچہ ناواقف تھے کہ قریبی خونی رشتوں میں شادی کمزور بچوں اور پیدائشی بیماریوں کا سبب بنتی ہے، البتہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ سوسائٹی اپنے ہی جالے میں الجھ کر بند نہ ہو جائے۔

(د) جنسی استثنا:

یہ بات تسلیم کی گئی کہ انسان کسی ایک ضابطے کے تابع مستقل طور پر نہیں رہ سکتا، چنانچہ کچھ مستثنیات بھی بنائی گئیں۔ مثلاً طلاق کا نظام وضع کر کے شادی میں استثنا پیدا کی گئی، تا کہ شادی کی ناکامی کی صورت میں اسے توڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ جنسی رشتہ قائم کیا جا سکے۔ کئی معاشروں میں شادی کے بعد بھی اپنے کسی مخصوص رشتے دار سے جنسی ملاپ جائز سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی اور دیگر تہذیبی تہواروں میں عارضی طور پر جنسی پابندیاں اٹھالی جاتی رہی ہیں۔ آج بھی دنیا کے بیشتر اقوام اور ممالک میں جنسی عمل کی خرید و فروخت کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں قائم و دائم ہے، جہاں حسب ضرورت جنسی تسکین کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ہمارا تہذیبی پس منظر اور جنسی اثرات

ہم یہاں دیکھیں گے کہ سماج میں عورت کی حیثیت کو متعین کرنے میں مذہب کا کردار اور شرعی نظریۂ جنس کیا رہا ہے۔ الہامی مذاہب میں اسلام اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں مرد و زن کے باہمی تعلقات کے بارے میں وسیع اور بالتفصیل لٹریچر موجود ہے۔

کہا جاتا ہے قبل از اسلام ''زمانۂ جاہلیہ'' میں مرد و زن کے درمیان بغیر نکاح جنسی تعلقات کا عام رواج تھا، جب کہ بعد از اسلام زنا کو حرام قرار دے کر جنسی تعلقات کے لیے باقاعدہ ضوابط مقرر کیے گئے، تاکہ معاشرے کو تہذیبی عمل سے روشناس کیا جا سکے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ تہذیب سازی کا یہ سارا عمل صرف عورت کے جنسی جذبے کو کنٹرول کرنے تک محدود رہا، جب کہ کثرتِ ازدواج، لونڈیوں کے ساتھ جنسی تعلقات اور طلاق کے ذریعے بیویاں بدل لینے کی اجازت سے مردوں کی سابقہ جنسی آزادی برقرار رہی۔ کثرتِ ازدواج کا حق مرد کو تفویض کرتے وقت صرف ''انصاف'' کرنے کی شرط عائد کی گئی جس کی قانونی زبان میں تعریف (definition) آسانی سے بیان نہیں کی جا سکتی۔ کوئی شخص کس حد تک ''انصاف'' کر رہا ہے، اس کا سراسر انحصار متعلقہ شخص کے اپنے معیارِ انصاف پر ہے۔ آسمانی متن میں کثرتِ ازدواج کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کی گئی، لیکن امام غزالی نے اسے مرد کی جبلت کے عین مطابق قرار دیا ہے۔

> ''جونہی مرد کو اپنے جنسی جذبے کے بیدار ہونے کا علم ہو تو اسے اپنی شدت کے تناسب سے اس کا علاج کرنا چاہیے۔ مقصد یہ ہے کہ روح کو تناؤ سے آزاد کیا جائے۔ اب اس آدمی پر منحصر ہے کہ وہ زیادہ بار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے یا کم۔ ایک ایسے آدمی کے لیے جس کی جنسی خواہش بڑی طاقتور ہے، ایک عورت کافی نہیں ہے جو اس کی پاکبازی کی ضمانت بن سکے، چنانچہ مرد کو زناکاری سے بچانے کے لیے اجازت دی گئی ہے کہ وہ مزید بیویوں کا اضافہ کر لے۔''

اور یہی موقف ہمارے آج کے بیشتر دینی پیشواؤں کا ہے۔ ان میں سے جو بظاہر تعلیم یافتہ ہیں وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سائنسی نظریات سے ثابت کر سکتے ہیں کہ مرد جنسی لحاظ سے عورت سے زیادہ طاقت ور ہے!

ہم دیکھتے ہیں کہ تقدیسی علوم میں عورت کی ضروریات اور احساسات کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور عورت کے لیے صرف ایک چوتھائی مرد ہی کافی قرار پاتا ہے، جب کہ مرد کی جنسی قوت کو چار سے ضرب دے دی گئی۔ عورت کو ایک سے زیادہ خاوند رکھنے کی اجازت اس لیے نہیں دی گئی کہ اس سے سماجی اور نسلی مسائل پیدا ہوتے ہیں، بلکہ اس سے یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ عورت ایک مرد سے مطمئن نہیں ہو سکتی جو سیدھی سیدھی مرد ذات کی توہین تھی اور مرد کی توہین مشیتِ ایزدی کو بھی برداشت نہ تھی کہ آخر مرد ہی زمین پر اس کا نائب تھا اور اسی لیے اگر سجدے کی اجازت ہوتی تو بیوی کو حکم ملتا کہ وہ خاوند کو سجدہ کرے۔ مذکورہ نظریے کے مضمرات کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ تقدیسی علوم کے مطابق جنسی فعل میں مرد ہی بنیادی اکائی ہے جب کہ عورت اس میں محض استعمال ہونے والی ثانوی درجے کی چیز ہے اور وہ ایک مرد کو مطمئن کرنے کی بھی اہل قرار نہیں دی جا سکتی۔ گھر کی چار دیواری کے باہر اس کی دنیا بند کرنے کے بعد اس بات کی بھی یقین دہانی کی گئی کہ کہیں وہ بستر پر برابری کی دعویدار نہ ہو جائے۔

مرد کو اجازت ہے کہ وہ دوسری کو گھر میں لا کر پہلی بیوی کی کم قدری اور سبکی کا کھلم کھلا اعلان کرے، اور وہ اس عمل کو ایک ایک سرکل میں چار بار دُہرا سکتا ہے، تاکہ عورت اور معاشرے پر خدا کے اس نائب کی مردانہ قوت کی دھاک بیٹھ جائے۔ یہ چار منکوحہ بیویاں ان عورتوں کے علاوہ

ہیں جو ''دائیں ہاتھ کی کمائی'' کہلایا کرتی تھیں۔ (یاد رہے مراکش میں لونڈیاں رکھنے کی رسم بیسویں صدی کے شروع میں اس وقت ختم ہوئی جب مغربی نوآبادکاروں کے زیر اثر زنانہ کی غلامی (female slavery) خاتمے کا اعلان ہوا۔ یہی حال دیگر عرب ملکوں کا تھا۔) اسی طرح اگر مرد اپنی بیوی کو کسی دوسری عورت سے بدلنے کی خواہش کرے تو مرد کو طلاق کا غیر مشروط حق حاصل ہے۔ شریعت اس سلسلے میں کسی عدلیہ کو مداخلت یا ثالثی کا حق نہیں دیتی۔ طلاق زبانی، تحریری اور فقط اشارے سے بھی ہوسکتی ہے! جونہی خاوند قاضی کو طلاق کے لیے کہے اسے مہرِ تصدیق ثبت کردینی چاہیے۔ اس کی حکمت یہ بیان کی جاتی ہے کہ یکسانیت بوریت پیدا کرتی ہے۔ ایک کے ساتھ مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے مرد کو زنا کی رغبت ہوسکتی ہے، چنانچہ اسے زنا سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری سمجھا گیا کہ شادی کے فریم ورک میں رہتے ہوئے مرد کو عورت بدلنے کی اجازت دی جائے! اس زبانی نصیحت کے ساتھ کہ طلاق مذاق نہیں بن جانا چاہیے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے نہ صرف مسلم بادشاہوں اور خلیفاؤں نے بلکہ کئی مقدس بزرگ ہستیوں نے بھی طلاق کا بے دریغ استعمال کیا۔ اس طرح مجموعی طور پر کئی درجن اور بعض اوقات سینکڑوں کی تعداد میں بیویاں رکھنے کا انھیں اعزاز حاصل ہے۔ دوسری طرف جسے زمانۂ جاہلیہ کہا جاتا ہے وہاں عورت کو اپنا خاوند چننے اور چھوڑنے کا حق حاصل تھا۔ عورت اپنے خاوند کو زبانی طلاق دے سکتی تھی، جس کا حق بعد از اسلام صرف مرد کو تفویض کردیا گیا۔ ظاہر ہے اگر عورت مرد کو چھوڑ سکتی تو یہ عورت کی اپنی آزادی اور خودمختاری کا باعث ہوتا، لیکن نظمِ جدید میں عورت کو حقِ خودارادیت نہیں دیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ عورت کو ضبط میں نہ لانے کا مطلب مرد کو بے راہ کرنا ہوتا، کیونکہ عورت کی خواہش میں بڑے سے بڑا پرہیزگار بھی ایمان کے تقاضوں سے لاپروا ہوسکتا ہے اور ایمانی رو سے جنسی طور پر ناآسودہ آدمی خطرناک ہے۔ اس لیے کہا گیا کہ اگر بیوی اس سلسلے میں کسی وقت مرد سے تعاون نہیں کرتی تو اسے بیوی کا نان نفقہ بند کرنے کا حق حاصل ہے، حتیٰ کہ غزالی کا فرمانا ہے:

''حیض کے دونوں میں خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیوی سے مشت زنی کروا کر جنسی تناؤ سے نجات پائے۔''

عورت طلاق مانگ سکتی ہے، اگر مرد جنسی لحاظ سے نااہل ہو، یا چار مہینے تک بیوی کے پاس نہ گیا ہو۔ عورت کو طلاق کا حق صرف مرد ہی تفویض کرسکتا ہے۔ بصورت دیگر خلع کے ذریعے عورت اپنی آزادی ''خرید'' سکتی ہے۔ اس سے پہلے عورت کو طلاق کے بعد فوری شادی کی اجازت تھی، حاملہ ہونے کی صورت میں بچے کی ولدیت دوسرے خاوند سے منسوب ہوجاتی تھی۔ لیکن نئی ترتیب میں بچہ پہلے خاوند کی ملکیت قرار پایا۔ فیصلہ یہ دیا گیا کہ عورت کو بچہ خاوند دیتا ہے، لہٰذا بچہ باپ کا ہوتا ہے، ماں کا نہیں۔ اس لیے طلاق کے بعد عورت کو کئی مہینے انتظار کرنے کو کہا گیا تاکہ اس بات تعین ہوسکے کہ بچہ کس خاوند کا ہے، تاکہ وہ بچہ اسے لوٹایا جائے۔ بچے پر باپ کی ملکیت کو اتنی شدت سے دیکھا گیا کہ ''عدت'' کی مدت اس عورت پر بھی لاگو کردی گئی جس کے حیض بھی ختم ہوچکے ہوں!

مرد کو کثرتِ ازدواج اور طلاق کا حق دینے سے یا ولدیت کا تعین اور زنا پر پابندی کے قوانین سے معاشرے میں نیکی کس حد تک پھیلی اس کا تو پتا نہیں، البتہ خاندان پر مردانہ کنٹرول انتہائی مضبوط ہوگیا اور ہر اس فعل پر پابندی لگ گئی جس سے عورت کی خودمختاری کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ اس سے قبل کثرتِ ازدواج کا تصور نہ تھا، البتہ قبضہ کرکے یا خرید کر شادی کرنے کا رواج جڑ پکڑ رہا تھا، جس کا استعمال نئے دور میں کئی گنا بڑھ گیا۔ پہلے بچے کا باپ کون ہے، اہم سوال نہ تھا، اسی طرح کنوارپن کے بھی کوئی سماجی معنی نہ تھے، اس لیے عورت کو خوراک اور تحفظ فراہم کرنا اس کے اپنے قبیلے کا فرض تھا۔ لیکن نئے نافذ شدہ پدرشاہی نظام میں خرید اور قبضے کی شادی کے جائز ہونے سے عورت کی حیثیت اور آزادی کا مکمل خاتمہ ہوگیا۔ تجارتی معیشت اور شہری تمدن کا فروغ پرانے قبائلی نظام اور اس کے فراہم کردہ تحفظات کو تباہ کررہا تھا۔ اب ملکیت اور وراثت اس کا حق تھا جو مقدس جنگ میں حصہ لے اور دشمنوں سے ان کا مال چھین کر لاسکے۔ نئے معاشرے کے لیے مضبوط جسموں والے مردوں کی ضرورت تھی، لہٰذا سماج میں انھی کی بالادستی کو شرعی حمایت فراہم کی گئی۔ پرانی قبائلی دشمنیوں کو مٹا کر وسیع تر مفاد کے لیے مقدس جنگ کی جانب موڑ دیا گیا اور وفاداری کے نئے رشتے استوار کردیے گئے۔ اب افراد کے درمیان رشتے داری کی وجہ بندھن نہیں، بلکہ عقیدہ تھا۔ باہمی تنازعات کا رخ جب مالِ غنیمت اور مذہبی جوش وجذبے کی طرف مڑا تو دنیا نے دیکھا کہ عربوں کے قدموں پر فارس اور بازنطین کی

شہنشاہی ریاستیں اس طرح گریں کہ انھیں صحرائے عرب سے اٹھنے والی تبدیلی کا ابھی پتا بھی نہ چلا تھا۔

پدرشاہی نظام کو تعینِ ولدیت اور جائز ولادت کے تصور نے اور تقویت پہنچائی۔ مادری نظام میں وراثت بہن سے بچوں کو چلی جاتی تھی، اب وراثت کو مرد کے بچوں تک محدود کر دیا گیا۔ ہمارے خاندانی نظام میں مرد کا فرض عورت کی جنسی ضرورت کو پورا کرنا اور اس کے نان نفقے کا بندوبست کرنا ہے۔ چونکہ نان نفقے کا ذمے دار مرد ہے، اس لیے عورت کے خودمختارانہ معاشی کردار کا کلاسیکل اسلامی معاشرے میں کوئی تصور نہیں۔ عورت کو بنیادی طور پر مرد کی دست نگر قرار دیا گیا ہے۔ اگر مذہبی لٹریچر اور دینی پیشوا عورت کے گھریلو کردار پر زور دیتے نظر آتے ہیں تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ عرب سوسائٹی پولیس کے نظام سے ناواقف تھی، چنانچہ اس نے اپنے گھر اور سماج کا ''پولیس مین'' مرد کو بنا دیا۔ وہ خاندان کا سرپرست بھی ہے اور ذمے دار بھی۔ بعد از اسلام قبیلے کی جگہ ایک سخت گیر قسم کے خاندانی نظام نے لے لی۔ اس نئے سماجی ڈھانچے کو چلانے کے لیے جن عائلی قوانین کو بنایا گیا اس میں مندرجہ ذیل فکری عناصر نے اہم کردار ادا کیا:

- مرد ہی معاشرے کی غالب قوت ہے۔
- عورت ایک جنسی فتنہ ہے، جس کا وجود صالح معاشرے کے لیے خطرہ ہے۔
- مرد کی جنسی تسکین کی اولیت اور ضمانت۔
- مردوں کی اللہ سے محبت اور اطاعت کی ضرورت (عورت کی بطور عابد حیثیت بھی دوسرے درجے کی ہے۔)

شریعت اور آئیڈیل عورت کا تصور

ہمارے ہاں عورت کا مقام اکثر ہی زیرِ بحث رہنے والا موضوع ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ عورتوں کو ڈیڑھ ہزار سال پہلے بے مثال حقوق مل گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود دیکھنے میں آیا ہے کہ شریعت کے نفاذ کی بات چھڑتے ہی مہذب دنیا اور عورتوں میں ہراس اور تشویش پھیل جاتی ہے، اس لیے کہ ''اسلامی نظام'' جب اور جہاں کہیں بھی آیا ہے، اس کے قواعد وضوابط اور تعزیرات کا پہلا نشانہ عورت ہوتی ہے۔ عورت پر کنٹرول اسلامی سماج کا سب سے اہم ستون ہے، چنانچہ عورت، شریعت اور خدا کے باہم رشتے کو سنجیدہ مطالعے اور تحقیق کا موضوع بنانا نہایت ضروری ہے۔

شریعت کی رو سے ایک آئیڈیل عورت کسے کہتے ہیں، اس کے لیے نہایت جید عالم ومفکر اور شارعِ اسلام امام غزالی اپنی کتاب ''احیائے علم دین'' میں لکھتے ہیں:

> ''مجموعی طور پر ایک عورت کا مناسب طرزِ عمل مختصراً یہ ہونا چاہیے کہ وہ زنان خانے تک محدود رہے۔ سینے پرونے کے عمل سے غافل نہ ہو۔ بالکونی پر بار بار نہ جائے اور نہ ہی اسے گلی کی طرف تاکنے میں وقت ضائع کرنا چاہیے۔ وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ مختصر سی بات کرسکتی ہے، لیکن ان کے ہاں اسے نہیں جانا چاہیے۔ عورت کی سب سے خراب ترین خطا یہ ہے کہ وہ باتیں زیادہ کرے۔''

یعنی آئیڈیل عورت وہ ہے جو خاموش طبع، غیر متحرک اور اطاعت گزار ہو۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکباز معاشرے کی تشکیل کے لیے عورت کو حق اظہار سے محروم، غیر متحرک اور کمزور کرنا کیوں ضروری ہے؟ ظاہر ہے ہر نظامِ حیات اپنے اندر ایک فلاسفی لیے ہوتا ہے۔ صنفِ نسواں پر کنٹرول اس سوشیالوجی کا اہم ترین ستون کیوں ہے؟ شرعی فلسفۂ حیات میں کسی بھی طرح کی مسرت (pleasure) سماجی نظم وضبط کی دشمن ہے، یعنی ہر وہ عمل جس سے انسان کو مسرت اور لذت حاصل ہو، وہ تخریب کاری کے زمرے میں آتا ہے، چنانچہ شرعی تہذیب کا مقصد ہر طرح کی لذت کو کنٹرول کرنا ہے۔ فلسفۂ شریعت میں قوت (power) سنجیدگی کا دوسرا نام ہے اور لہو ولہب کمزوری کی علامت۔ کائنات میں سنجیدہ ترین ذات خدا کی ہے، لہٰذا سب سے زیادہ طاقت کا مالک بھی وہی ہے۔ خدا کے بعد اس زمین پر سنجیدگی کی دوسری علامت مرد ہے، چنانچہ اس زمین پر سب سے زیادہ طاقت خدا نے مرد کو عطا کی ہے۔ لذت اور مسرت کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے عورت غیر سنجیدہ ذات ہے، اسی لیے اسے سماج میں کمزور حیثیت کا حقدار ٹھہرایا گیا ہے۔ مرد خدا کا نائب ہے اور اس کی اطاعت اور عبادت زندگی کا مقصد۔ چونکہ عورت مرد کو اپنی طرف مائل کرنے کی کشش رکھتی ہے، چنانچہ اس سے مرد کے غیر سنجیدہ یعنی اللہ سے دور ہوجانے کا اندیشہ پیدا ہوسکتا ہے۔ شرعی نظام میں خدا، حکمران مذہبی پیشوا اور مردانہ آبادی سنجیدگی اور طاقت کی نر (male) علامتیں ہیں۔

انسان کو مسرت سے دور کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اسے آزادانہ فیصلے (free will) سے محروم کردیا جائے، یعنی نہ انسان اپنے ذہن کے مطابق کوئی فیصلہ کرسکے اور نہ عمل پیرا ہوسکے۔ چنانچہ شریعت کسی فرد کو کہیں بھی آزادیِ فکر وعمل کی اجازت نہیں دیتی؛ خواہ اس کا تعلق سیاسی مسائل سے ہو یا بیڈروم کی خلوت سے، آپ طے شدہ اصولوں اور ضوابط کے پابند ہیں۔ ہر فرد کا دائرۂ کار متعین ہے۔ اس سارے صالح بندوبست میں گڑبڑ کا اندیشہ ایک ہستی کی طرف سے ہوسکتا ہے اور وہ ہے عورت۔ مقدس مائتھالوجی کے مطابق تخلیقِ کائنات کی اولین خدائی حکمت میں عورت کے جنم کا خیال موجود نہ تھا۔ مرد کو خدا نے اپنے مقدس ہاتھوں سے بنایا اور پھر اس کے اندر اپنی مقدس روح پھونکی، لیکن عورت کی تخلیق نہ صرف ضمنی طور پر وجود میں آئی بلکہ وہ پیدا بھی غیر فطری طریقے سے ہوئی، یعنی مرد کی پسلی سے نکالی گئی، گویا عورت کی تخلیق میں خدا کی براہِ راست دلچسپی کا اظہار نہیں ملتا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ ذات خدائی اسکیم (divine order) میں خلل کا باعث بننے والی ہے

چنانچہ اس نے پیدا ہوتے ہی آدم کو اپنے خدا سے ورغلانے کی تخریبی کاروائی شروع کر دی۔ آدم اور خدا کا باہم براہ راست تعلق تھا، جب کہ عورت کا خدا سے تعلق تھرڈ پارٹی کے طور پر ثانوی اور مرد (آدم) کے توسط سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین پر انسانوں کے بسنے کے بعد خدا نے براہِ راست پیغام کے لیے صرف مردوں کا انتخاب کیا۔ ضرورت پڑنے پر عورت سے متعلقہ باتیں بھی صرف مردوں کے توسط کی گئیں، چنانچہ عورت کو خدا نے براہ راست مخاطب نہیں کیا۔

خدا اور عورت کے درمیان بیگانگی کا رشتہ قابلِ فہم ہے۔ خدا نے مرد کو اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا تھا، لیکن عورت مرد کو اپنی ذات کی طرف کھینچتی ہے۔ اس لیے خدا نے اپنے مقرب مردوں کے توسط سے جب ضابطۂ حیات بھیجنا شروع کیا تو اس میں خصوصی بندوبست کیا گیا کہ مرد عورت کے ساتھ زیادہ دیر مشغول نہ رہے۔ ضروری لحاتی ملاپ کے بعد مرد خدا کے فریضۂ بندگی کی طرف فوراً لوٹ جائے۔ شریعت مطالبہ کرتی ہے کہ عورت کو مرد کے مقابل مغلوب اور مطیع ہونا چاہیے اور وہ ایک ایسا خاندانی نظام تشکیل دیتی ہے جس میں عورت صرف بیوی ہے یا ماں۔ اس کا جنسی ساتھی صرف ایسا مرد ہی ہوسکتا ہے جسے اس کے ''ولی'' (مرد سرپرست) نے منتخب کیا ہو۔ چنانچہ اس کے لیے ضروری تھا کہ عورت کو غیر متحرک (immobilized) کیا جائے۔ اسے چھپا کر رکھا جائے، گھر میں بند کیا جائے اور مردانہ آبادی سے زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک الگ تھلگ رکھا جائے، کیونکہ ''نامحرم'' اور ''دوسرے آدمی'' کا خطرہ ہر وقت معاشرے میں موجود ہوتا ہے۔ گویا شادی کا مطلب دو مردوں کے بیچ ایک چیز کی طرح عورت کا تبادلہ ہے— لڑکی کا ولی، (باپ، بھائی یا کوئی اور مرد رشتے دار) اسے مستقبل کے خاوند کے حوالے کرتا ہے۔ اس سلسلے میں عورت کی اپنی پسند سماجی نظم میں تخریب کاری کا باعث بن سکتی ہے۔ فقیہوں نے بیوی کے انتخاب کے پیمانے بڑی تفصیل سے بیان کر رکھے ہیں لیکن عورت کے لیے مرد کس طرح کا ہونا چاہیے اس پر مذہبی لٹریچر خاموش ہے، اس لیے کہ اسے شریکِ حیات منتخب کرنے کا عملاً کوئی حق حاصل نہیں۔

یہ سماجی مسئلہ ہے کہ پاکباز معاشرے کا ''تخریب کار'' گھر کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔ پاکباز معاشرے کی تشکیل طاقت کی درجہ بندی پر کی جاتی ہے۔ سب سے اوپر طاقت ور ترین ہستی خدا کی ہوتی ہے، پھر حکمران اور پھر معاشرے کے مرد افراد آتے ہیں۔ اس درجہ بندی میں عورت سب سے نچلے اور کمزور درجے پر آتی ہے، جس پر خدا، حاکم اور مرد تینوں کی حکمرانی مسلط ہے، چنانچہ عورت کے پاس اپنی ذات کے اظہار کے لیے صرف ''تخریب کاری'' ہی باقی رہ جاتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے محاورے اور داستانیں زبان زدِ عام ہیں جن کے مطابق عورت قابلِ بھروسہ ذات نہیں۔ دراصل متعدد بیویاں رکھنے والے کلچر میں اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے عورت کو ناقابلِ بھروسہ اور بے وفا مشہور کرنا مردوں کی مجبوری تھی۔

عصمت فروشی کا سب سے بڑا سبب معاشی عوامل کی بجائے عورت کی جنسی بھوک کو قرار دیا گیا اور یہ تصور اس قدر ذہنوں اور عقائد میں راسخ ہے کہ ان ممالک کے محققین اسے سائنسی علم کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ عورت چونکہ عام حالات میں صرف ایک مرد کے لیے مخصوص ہے، وہ اپنے جنسی مطالبے کی شدت کی وجہ سے اسے سب کے لیے کھول دیتی ہے۔ شرعی عدالتوں کی تاریخ ایسے فیصلوں سے بھری پڑی ہے جہاں ''حدود'' کے کیسوں میں مردوں کے مقابلے میں عورت کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے۔ خود پاکستان میں جنرل ضیا کے دور کی شرعی عدالت نے ایک اندھی عورت کو زنا کے جرم میں بیس کوڑے مارنے کی سزا دے دی تھی اور جرم میں ملوث مرد کو ''چار صالح عینی شاہدوں'' کی عدم دستیابی کی وجہ سے بری کر دیا تھا! چار صالح عینی گواہوں کی شرط کو بھی بالآخر زانی مرد کو فائدہ دینے میں استعمال کیا گیا۔ عورت چونکہ حمل کی مرتکب ہوسکتی ہے چنانچہ گواہ ہو یا نہ ہو وہ سزا کی لازماً مستوجب ٹھہرتی ہے!

مولوی سماجیات میں مرد پوزیشن کے لحاظ سے عمودی اور عورت افقی ہے۔ یعنی مرد نیچے سے اوپر کی طرف ترقی کرسکتا ہے جب کہ عورت کی پوزیشن میں تبدیلی واقع نہیں ہوسکتی۔ وہ کسی بھی رشتے میں ہو، مرد کے ماتحت ہے۔ مرد متحرک اور جاندار حیثیت کا حامل ہے جب کہ عورت

غیر متحرک اور غیر جاندار ہے۔ اس کے ساتھ شے کی مانند سلوک ہونا ہوتا ہے۔ مرد جاندار ہے، اس کو خدا نے صاحبِ ارادہ بنایا ہے، جبکہ عورت کو کسی بھی شے کی طرح اپنی مرضی (will) سے دستبردار کر دیا ہے۔ اسی لیے عورت کو مال و متاع اور ان چیزوں میں شمار کرتا ہے جو مرد کا دل موہ لیتی ہیں۔ جنسی اور تخلیقی فعل میں مرد و زن کی حیثیت برابر تسلیم نہیں کی گئی — مرد کنٹرول کرتا ہے، عورت معمول بن کر خود کو پیش کرتی ہے۔ یہاں پر بھی مردانہ غلبے کا اصول پوری طرح کارفرما ہے: انسان کی ایک کیٹگری دوسری کیٹگری کو مغلوب کرتی ہے۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جب ایک فریق کو شے (commodity) کے درجے تک لے جایا جائے۔

عورتوں اور بچوں کو مال و متاع کے زمرے میں گنا جاتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے ان کی انسانی حیثیت مستقل نوعیت کی نہیں، ان کا وجود مرد کی محض وسط مدتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ صاف کہا گیا ہے کہ عورتوں اور بچوں کو مرد کی فرحت اور خاطر داری کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ''اور پھر انسان کو خوشیاں عطا کیں عورتوں اور بچوں کی... سونے اور چاندی کے ڈھیروں کی... اور نشان زدہ گھوڑوں کی۔۔۔ مویشیوں اور زمین کی...'' یہاں انسان سے مراد صرف مرد ہیں! تمھارے لیے تمھیں بیویاں دیں اور پھر ان سے بیٹے اور پوتے دیے اور کتنی اچھی اچھی ''چیزیں'' آپ کو دیں۔ بار بار مرد کو جتلانا کہ ہم نے تمھیں بیویاں دیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت وہ شے ہے جو مرد کو دی گئی اور اسی کے لیے پیدا کی گئی، وہ برابر کی سطح پر انسانی حیثیت کی مالک نہیں، بیٹوں اور پوتوں کا بطورِ نعمت ذکر ہے، بیٹیوں اور پوتیوں کا نہیں۔ عورت پر مرد کی بالادستی اور برتری کی دلیل میں کہا گیا ہے کہ مرد عورت کو نان نفقہ مہیا کرتا ہے، گویا عورت کی خود کفالت کا کوئی تصور نہیں۔

مذکورہ فلسفے کی بنیاد پر جو صالح معاشرہ تشکیل پاتا ہے اس کے پس منظر میں ایک ایسی جنسی دنیا کی کارفرمائی ہے جہاں مرد کے دماغ میں ہر دم خوف رہتا ہے کہ وہ عورت پر قابو پانے میں ناکام نہ ہو جائے اور عورت کہیں اسے مسترد نہ کر دے، یا یہ کہ وہ عورت کو مطمئن کر سکے گا یا نہیں۔ وقت مباشرت کی دعا:

''اے خدا! تو ہی میری مدد کر اور مجھے بغیر ذلت اور نقصان کے اس عمل سے نکال لے۔''

اس طرح کے صالح معاشروں کے حکیم حضرات مردوں کے لیے خصوصی کشتے تیار کرتے ہیں کیونکہ ان کی طب کے مطابق جنسی فعل سے مرد کمزور ہوتا ہے اور عورت انرجی حاصل کرتی ہے!

مولوی نظامِ حیات صرف اور صرف اطاعتِ خداوندی کا نام ہے۔ ایمان یافتہ شخص کا جسم اور روح دونوں ہی ہر وقت خدا کے ممنون ہونے چاہئیں۔ خدا کسی ایسی چیز کو برداشت نہیں کر سکتا جو اس کے بندے کو ایک لمحے کے لیے بھی عبادت کے فریضے سے غافل کر دے۔ سب سے زیادہ گنہگار عمل یہ ہے کہ ایمان یافتہ شخص خدا کی بجائے کسی اور ذات کی تمنا اور خدمت شروع کر دے۔ لیکن عورت کی رفاقت ایک ایسی چیز ہے جس سے ایمان یافتہ شخص اپنے خدا سے کم از کم لمحاتی طور پر غافل ہو سکتا ہے۔ خوشی، مسرت اور لذت اس لیے تقدیسی نظام میں حرام ہیں کہ یہ انسان کو خدا سے دور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شرعی تہذیب و معاشرت میں خوشی، مسرت اور لذت عطا کرنے والے سبھی فنون، تہوار، رشتے، اشیا اور رسوم حرام ہیں یا ناپسندیدہ۔ کھل کر ہنسنے پر بھی باقاعدہ پابندی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جائز جنسی لذت کو بھی خدا کے مقابلے میں دنیاوی زندگی اور عورت کی فتح سمجھا جاتا ہے۔ بقول امام غزالی:

''شادی کے ادارے میں سب سے بڑا ابہام اور تضاد یہ ہے کہ یہ مرد کو عورت کے جسم سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دیتا ہے، اس مطالبے کے ساتھ کہ یہ لطف اندوزی خدا کے ساتھ اس کی وفاداری میں کوئی مداخلت پیدا نہ کرے۔ اس طرح

شادی دو متضاد اور نا قابلِ مصالحت وجودوں کے درمیان ایک بارڈر لائن ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔''
(''احیائے علم دین'' کے باب ''خدا اور عورت'' سے)

عورت مرد کی توجہ کو خدا سے ہٹانے کا سبب بنتی ہے، لیکن مرد کی نسل پیدا کرنے کے لیے اس کا عورت کے پاس جانا بھی ضروری ہے۔ امام غزالی کو داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ انھوں نے کتنے اہم تضاد کی طرف نوع انسانی کی توجہ مبذول کروائی ہے! وہ اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''شادی کی سرشت میں یہ خطرہ موجود ہے کہ عورت کے ساتھ لذت آمیز جسمانی بندھن کی اجازت سے مرد کو عورت کے پاس زیادہ سے زیادہ دیر رہنے اور اس سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کی ترغیب نہ مل جائے۔ شادی میں یہ ''رسک'' ہے کہ مرد صبح و شام عورت کے خیال میں ہی گم ہو جائے اور اس طرح آخرت کی فکر اور اس کی تیاری سے غافل ہو جائے۔ اس تناظر میں ابراہیم ابن ادھم کے ریمارکس کو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ جس نے خدا سے رحم کی دعا مانگتے ہوئے کہا تھا، 'جسے عورت کی ٹانگوں میں رہنے کی عادت پڑ گئی وہ زندگی میں کبھی کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتا'۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنا نہایت مشکل ہے کہ کسی انسان کے لیے شادی ٹھیک ہے یا تجرد کی زندگی۔ ایک طرف خدا اور آخرت ہوگی اور دوسری طرف عورت، جسم اور دنیاوی زندگی۔ مردِ مومن ان میں منقسم ہو کر اذیت کا شکار رہے گا۔ چنانچہ ضروری ہے کہ وہ انھیں حقیر جانے اور اپنا مطیع کرے...'' (ایضاً)

جنس و محبت کی باتیں شرع میں حرام ہیں، کیونکہ ان باتوں کا لامحالہ مطلب ایک کمتر، مطیع، مغلوب، دبی ہوئی اور خارج شدہ ذات کی خواہش میں دلچسپی لینا ہے۔ شرع کے نزدیک دلچسپی اور تحقیق کے قابل صرف خدا کی ذات ہے۔ مردوں پر واجب ہے کہ خدا کے آگے دوزانو ہونے کی بجائے عورت کے جسم کے سامنے گھٹنے نہ ٹیک دیں۔ یہ مرد کے لیے شرم کی بات ہے کہ وہ ایسی دنیا میں جانے کی بات کرتا ہے جہاں عورت طاقتور ہے اور مرد کمزور۔

کہا جاتا ہے کہ فحش نگار انسان کو انسان نہیں رہنے دیتے، انھیں جنسی حیوان بنا دیتے ہیں؛ اس کے مقابلے میں شرعی دنیا روحانی دنیا کی علمبردار ہے جو مادی اور حیوانی سطح کی لذت انگیزی کو محدود کرتی ہے، تاکہ انسان کی ذہنی جہت متاثر نہ ہو اور خدا کی ذات سے ہم آہنگ ہو کر لامحدودیت کے احساسات سے دوچار کر سکے۔ لیکن جن کا دعویٰ انسان کے روحانی پہلو کو ترقی دینا ہے، وہ مرد و زن کے درمیان ہر آن جنسی امتیاز کو اجاگر کر کے وہی کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہم نے اس سوال کے جواب کا کھوج نکالنا ہے کہ کیا شریعت عورت کی ذات کو بھی روحانیت کی سطح پر پہنچانا چاہتی ہے یا نہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو شریعت جس کا مقصد ہی مادی دنیا کو روحانی جہت سے آشنا کرنا ہے، عورت کے معاملے میں ایسا کرنے سے انکار کیوں کرتی ہے؟ اس سے ہمیں پتا چلے گا کہ مذہبی نظام عورت کے وجود کو کن نظروں سے دیکھتا ہے۔ کیا شریعت کی نظر میں عورت کا جسم بھی کثیر الجہت ہے؟ کیا اس میں جسمانی ذہنی اور امنگیں بیدار کرنے والی صلاحیتیں اور امکانی استعداد کار موجود ہے یا نہیں؟ کیا شریعت عورت کو ایک بھرپور انسان کے طور پر تسلیم کرتی ہے یا نہیں؟ کیا شریعت عورت کی ذات کو روحانی بنانے میں دلچسپی رکھتی ہے یا اس کو غیر ذی روح اور غیر معقول قرار دے دیتی ہے؟

شریعت میں صداقت کا ذریعہ اور راہنمائی کے قوانین سبھی خدا کی طرف سے آتے ہیں۔ جنس اور تقدیس کے باہمی رشتے پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ جنس بھی زندگی کو جنم دیتی ہے اور خدا بھی زندگی کا خالق ہے۔ حقیقت کی دنیا میں جنس زندگی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، عورت ہر روز بچے پیدا کر رہی ہے، لیکن تصور اور تجریدی دنیا کے مطابق زندگی خدا پیدا کر رہا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ پیدا کرنا ایک جنسی فعل ہے جب کہ خدا خود کو جنسی فعل سے مبرا قرار دیتا ہے۔ گویا تخلیق کے معاملے میں عورت اور خدا کے درمیان ایک کھلا تضاد سامنے آ جاتا ہے۔ حقائق کی سطح پر

صرف عورت کا وجود ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور جو عناصر اس حیات کو تخلیق دیتے اور برقرار رکھتے ہیں وہ ہماری نیچر اور اس کی پیدا کردہ حیوانات اور نباتات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لیکن تقدیسی لٹریچر عورت اور نیچر دونوں کو زندگی پیدا کرنے یا اسے برقرار رکھنے سے عاری قرار دیتا ہے۔ یوں خیال کو مادے پر فوقیت دے دی جاتی ہے، اور مذکر کو مونث کے خلاف کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ گویا ایک ایسا فریق فطرت اور عورت کی طاقت سلب کرنے کا دعویٰ کر دیتا ہے جو حقائق کی رو سے نہ پیدا کرتا ہے نہ غذا فراہم کرتا ہے۔ خدا کو کسی نے نہیں جنا اور مرد خود کو پیدا نہیں کر سکتا، چنانچہ عورت کی پیدا کرنے والی صلاحیت بحقِ خدا چلی جاتی ہے۔ اپنے آخری تجزیے میں اس کا مطلب انسان کو بے مقدور اور ناتواں قرار دینا ہے۔ انسانی زندگی کے بارے میں تمام تفصیلات اور قوانین کی ترتیب خدا کا کام اور اسی کی مرضی پر منحصر ہے۔ ہمارا کام صرف اس کی عبادت کرنا ہے۔

ہمارے شرعی علوم میں اس بات پر بھی بحث رہی ہے کہ کیا خدا نے کبھی عورت کو بھی مخاطب کیا ہے؟ یا ان کی حیثیت محض ایک غائب سامع کی سی رہی ہے؟ اس سلسلے میں ابن خلدون اپنی کتاب ''المقدمہ'' میں ابن الخطیب سے اتفاق کرتا ہے کہ ''خدا نے اس وجود کو مخاطب کیا ہے جو نفاذ کی طاقت رکھتا ہے۔ اکثریتی دینی احکامات میں عورتوں کو مخاطب نہیں کیا گیا تاہم عورتوں پر بھی ان احکامات کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے جیسے مردوں پر۔ بقول ابن الخطیب کے عورتیں اس میں بالقیاس شامل ہیں۔ عورتوں کو اس لیے مخاطب نہیں کیا گیا، کیونکہ ان کے پاس طاقت نہیں ہے۔ یہ مرد ہیں جو عورتوں کے افعال کو کنٹرول کرتے ہیں۔'' یعنی کمزور، ضعیف اور ثانوی درجے کی حامل عورت سے خدا بھی مخاطب ہونے سے گریزاں ہے، وہ صرف طاقت ور سے ہم کلام ہوتا ہے۔ عورت کی ذات کو سنبھالنا مرد کا کام ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ صراطِ مستقیم پر چلنے والا چاہے مرد ہو یا عورت، جنت میں جائے گا، لیکن سماج کی تنظیم اور انتظامی معاملات میں عورت غائب ہے۔ حتیٰ کہ عائلی قوانین میں بھی جن کا عورت کے ساتھ براہ راست تعلق ہے، خدا نے عورت کو مخاطب نہیں کیا۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ حیاتیاتی زماں میں عورت مرد کو جنم دیتی ہے، لیکن تقدیسی زماں میں عورت مرد کے بعد جنم لیتی ہے۔ خدا مرد سے یوں مخاطب ہوتا ہے، ''ہم نے تمھارے لیے معاونت کرنے والی ساتھی پیدا کی، تاکہ تم اس سے راحت حاصل کر سکو۔'' تقدیسی وقت حیاتیاتی زماں کو بالکل الٹا کر رکھ دیتا ہے۔ طاقت اسے دے دی جاتی ہے جو پیدا نہیں کرتا۔ عورت سے نہ صرف اس کی پیدا کرنے کی صلاحیت (procreative capacity) چھین لی جاتی ہے، بلکہ پیدائش کے سلسلے کو بھی الٹا کر دیا جاتا ہے، تاکہ عورت کو کمزور ثابت کیا جا سکے۔ تقدیس میں بعد میں جنم لینے والی ہستی پہلے وجود میں آنے والی ہستی کے مقابلے میں ملکیت سے محروم (dispossessed) ہو جاتی ہے۔ زماں ہی طاقت کا موجب ہے۔ خدا سب سے پہلے وجود میں آیا اس لیے وہ لامحدود طاقت اور اثر کا مالک ہے۔ پھر فرشتے، آدم، عورت اور آخر میں بچے۔ خدائی ڈیزائن میں مرد و زن ہم جنس (homogeneous) مخلوق نہیں اور نہ ہی ان کے فرائض کو اس کے سکے کے دو رخ قرار دیا جا سکتا ہے، بلکہ ان کے درمیان درجہ بندی (hierarchy) کا رشتہ ہے۔ ایک برتر پوزیشن پر ہے دوسرا کمتر، ایک نیچے ہے دوسرا اوپر۔

بہشت میں تنہا عورت

عورت جب خدا اور اپنے خاوند کی مکمل اطاعت گزاری کے بعد جنت میں داخل ہو گی تو وہاں حور کے ساتھ اسے سخت مقابلے بازی (competition) کا سامنا ہوگا۔ یہ سمجھ سے باہر ہے کہ حور کی خوبصورتی کا جو رنگ روپ اور نقشہ بیان کیا گیا ہے، اس کے مقابلے میں اس بے چاری عورت کی کیا حیثیت ہوگی؟ جب کہ جنت میں وہی مرد ہوگا جو اس دنیا میں کسی ایک عورت پر نہیں ٹکتا! وہاں تو اسے کھلی چھوٹ ہو گی۔ ایسے حالات میں یہ زمینی عورت جنت میں جا کر بھلا کرے گی کیا؟ جنت کی آبادی (demography) کا تجزیہ کریں کہ وہاں کے رہنے والوں میں آپس کے تعلقات کس طرح کے ہوں گے، ماحول کے ساتھ ان کا رشتہ کس طرح کا ہوگا، وہ زندہ کس طرح رہیں گے، وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں زمین پر آبادی کے لحاظ سے نعمتوں کی قلت ہے۔ اس کے مقابل جنت میں دولت بے حساب ہوگی۔ ہاتھ بڑھانے پر مطلوبہ چیز گرفت میں ہوگی۔ پھل، پرندوں کا گوشت، دودھ، شہد، شراب، خالص پانی، گھنے سایہ دار درختوں کی قطاروں کے درمیان ندیاں بہہ رہی ہوں گی۔ موسم معتدل ہوگا۔ بغیر کانٹوں والے پودے ہوں گے۔ مکمل امن ہوگا، ماحول اور انسان میں کوئی تصادم نہ ہو گا۔ بہشتی مردوں کی روزمرہ سرگرمیوں کا دائرہ نہایت محدود ہوگا۔ ان کا کام کھانا پینا اور اپنی حلیم و ملائم جنسی ساتھی حوروں کے ساتھ لطف اندوز ہونا ہوگا۔ جنت میں آرام ہی کام ہوگا! زندگی تمام جدوجہد سے مستثنیٰ ہوگی۔ سونا چاندی، ہیرے جواہرات اور سلک کے قیمتی لباس جنت کے شہریوں کا عام لبادہ ہوں گے۔ فرنیچر میں گدے، بستر، تکیے، قالین اور پینے کے لیے شیشے کے جام ہوں گے۔ البتہ کرنے کا کام ایک ہی ہوگا، اور وہ ہے حوروں کے ساتھ ہم بستری، اس کے علاوہ مکمل بے کار رہنا ہوگا۔

جنت کا ایک اور حیرت انگیز پہلو ہے۔ وہاں کا ماحول آپ پر مکمل مہربان ہوگا۔ اِدھر خواہش کریں گے اُدھر چیز سامنے ہوگی، لیکن اس کے باوجود وہاں پر نوکر یعنی غلمان دستیاب ہوں گے، (حالانکہ جنت میں سب کام خود بخود ہو جائیں گے)۔ یہ جنسی لحاظ سے نر، نوجوان اور خوبرو ہوں گے — ان کا مقصد بہشتی مردوں کی ''خاطر داری'' کرنا بتایا جاتا ہے! وہاں ابدی جوانیاں اہلِ ایمان کے انتظار میں بیٹھی ہوں گی۔ یہ نہیں معلوم زمینی عورت اور حور کے درمیان تعلقات کس نوعیت کے ہوں گے اور ان دو عورتوں کے جنتی مرد کے ساتھ تعلقات کی کیا صورت ہوگی۔ ایک اور غیر واضح پہلو یہ ہے کہ کیا جنت میں بچے ہوں گے اور کیا وہ ہمیشہ بچے ہی رہیں گے؟ جنت کی سماجی ساخت کیا ہوگی؟ کیا جنت میں سب افراد کا رتبہ ایک جیسا ہوگا؟ کیا وہاں خاندانی وحدت کا بھی وجود ہوگا؟ کیا بہشتی فیملی میں جوڑے کا بھی تصور ہوگا؟ مقدس ذرائع ان کے متضاد جوابات دیتے ہیں۔ ایک ایمان یافتہ عورت اپنے ذاتی اعمال کے نتیجے میں بھی جنت جا سکے گی اور ایمانی مرد کی بیوی کے صلے کے طور پر بھی۔

جنت کو مکمل طور پر مرد کی خواہشات اور ضرورتوں کے مطابق بنایا گیا ہے۔ ابدی جوان اور خوبصورت جنسی ساتھیوں کی موجودگی میں اس زمینی عورت کا جنت میں قیام مسرت کی بجائے تشویش، بے چینی اور اضطراب کا ہی باعث ہو سکتا ہے۔ جو بھی نیک کام کرے گا، مرد یا عورت، جنت میں جائے گا، لیکن جب ہم جنت کے مکان، ماحول اور قیام سے متعلق بندوبست پر غور کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ بہشت کی ساری تنظیم جنسی بنیادوں پر کی گئی ہے اور اسے جن ''اشیا'' سے لیس کیا گیا ہے وہ ساری کی ساری صرف مردوں کے استعمال کے لیے ہیں۔ سدا تازہ جوان جنسی ساتھی کی موجودگی میں زمینی عورت کی وقعت نہ ہونے کے برابر ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی جنسی ضروریات سے حیرت انگیز طور پر اغماض اور لاتعلقی برتی گئی ہے۔ زمینی زندگی ہو یا بہشتی، بات ایک ہی ثابت ہوتی ہے — عورت کو انسان نہیں سمجھا گیا۔ عورت ایک اضافی اور ثانوی مخلوق ہے۔ جہاں تک مردوں کی ضروریات کا تعلق ہے، اسے مزے لے لے کر تمام باریکیوں اور جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، بلکہ پیرایۂ بیان میں مردوں کی جنسی خواہشات کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حوروں کی آنکھوں، عمر، کردار، اور ان کے پردۂ بکارت کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن زمینی عورتوں کے بارے معمولی سا ذکر بھی کہیں نہیں کیا گیا۔ حوروں کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ

وہاں زمینی عورت کے وجود کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔

سوال یہ ہے، اس سارے ماحول میں اس زمین کی عورت کیا کر رہی ہوگی جس نے بڑے خشوع وخضوع سے خدا کے بتائے ہوئے نیک اصولوں کے مطابق زندگی گزاری تھی؟ اس سارے تناظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنت میں دنیاوی عورت محض وہاں ایک سائے کی طرح زندگی گزارے گی۔ مرد جنت کے ماحول میں پوری طرح رچ بس جائے گا۔ ریشمی کپڑوں میں ملبوس حوروں کی باقاعدہ شادی کروائی جائے گی۔ گویا زمینی عورت مخمل میں لگا ٹاٹ کا ٹکڑا ہوگی۔ جنت کی پُرسکون دنیا میں عورت کی جگہ پر پہلے ہی قبضہ ہو چکا ہے۔ اس دنیا میں عورت مرد کی جنسی ساتھی تھی، اس کے بچوں کی ماں ہونے کے ناتے ہی کچھ عزت پا لیتی تھی، جنت میں وہ بھی نہ رہی!

آیئے ذرا غور کریں کہ حور کس طرح کی بہشتی اقدار کی نمائندگی کرتی ہے۔ حور کے بارے میں جتنی بھی تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان سب کا تعلق صرف جسم کے ساتھ ہے۔ حور کی شخصیت کا کوئی روحانی پہلو نہیں۔ وہ محض ایک چیز ہے۔ نہ اس کی کوئی انا (will) ہے، نہ اس کی ذات میں نشوونما پانے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسے صرف ایمان یافتہ مرد کے جنسی استعمال کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کی وقعت صرف جسمانی خوبصورتی کی وجہ سے ہے۔ وہ ایک تحفہ ہے جو خدا نے ایمان والے کو دیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے، ساری زندگی کی بندگی وعبادت کے نتیجے میں کیا مل رہا ہے — ایک مصنوعی قسم کی عورت! انسان کی تعریف یہ ہے کہ اس کی ذات میں ارتقا و ترقی کے لامحدود امکانات ہیں۔ وہ غیر متوقع اور طے شدہ راستے سے ہٹ کر کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی آزادی اور اختیار کے ساتھ کسی بھی قاعدے کو توڑ کر اپنی مرضی کر سکتا ہے۔ حور انسان نہیں، وہ ایک خوبصورت سی جنسی گڑیا ہے۔ اسے نہ انتخاب کی آزادی ہے نہ اپنی ذات کو ترقی دے سکتی ہے۔ وہ یک رخی قسمت (sole destiny) کے ساتھ پیدا کی گئی ہے۔ گویا حور اور منعم مرد کے درمیان کوئی ذہنی اور روحانی رشتہ نہیں ہوگا۔ حور کسی ذہن (intellect) کی حامل نہیں ہے۔ اسے تو صرف تصرف کا انتظار ہے۔

لیکن ٹھہریے! جنت میں صرف حور ہی ایک چیز (thing) نہیں، اب مرد کی بھی انسانی حیثیت باقی نہیں ہوگی، وہ بھی ایک جنس زدہ روبوٹ میں ڈھل جائے گا۔ اس کی ذات کے صرف دو فنکشن کام کر رہے ہوں گے — ایک نظام ہاضمہ اور دوسرا جنسی اعضا! کھانے اور جنسی فعل کے علاوہ تا ابد اسے کوئی کام نہ ہوگا۔ بلکہ جنسی فعل کے تخلیقی پہلو کا بھی خاتمہ ہو گیا ہوگا۔ حور بھی ہمیشہ کے لیے کنواری ہے، وہ بھی کبھی ماں نہ بن سکے گی۔ چنانچہ بہشت دو اشیائے صرف پر مشتمل ہے — حور اور خوراک — جسے ایک ایمان یافتہ صارف کے لیے وقف کر رکھا گیا ہے۔ یعنی جہاں زمینی عورت کو جنت میں لاوارث چھوڑ دیا گیا ہے وہاں مرد کو بھی سیکس اور خوراک کترنے والی مشین میں بدل دیا جائے گا۔ اس کا ارادہ، ادراک اور تمام فکری وذہنی صلاحیتیں ختم ہو جائیں گی۔ بہشت کا باسی مرد مجہول اور مفعول شخصیت ہے، کھانا کھاتا ہے اور اس مخلوق سے مباشرت کرتا ہے جو رحمِ مادر سے محروم ہے یا پھر آرام کرتا ہے۔ اس زمین کی زندگی فانی سہی، کیا اس کو ایسی مشینی اور جامد ابدی زندگی پر ترجیح دی جا سکتی ہے؟ کیا ایسی بے مقصد ''آخرت'' کی زندگی کی خاطر اس زندگی پر سے اپنا اختیار کسی (فرضی) ماورائی طاقت کے حوالے کیا جانا شرفِ انسانیت کہلا سکتا ہے؟ تقدیسی نظام اور خدائی اسکیم کا صرف ایک ہی مقصد کیوں ہے کہ انسان کو انسان نہ رہنے دیا جائے؟ اس زندگی میں بھی اس کا یہی مطالبہ ہے کہ وہ خود سے کچھ نہ سوچے، بنا بنایا پورا تصور کائنات اور ضابطۂ حیات اس کے ہاتھ میں تھما دیا جاتا ہے کہ اب تم اپنی عقل اور شعور کے سب ہتھیار خدا کی بارگاہ اور اس کے مقربین کے حوالے کر دو، جو تم سے کہا جائے وہ کرو، تم غلام ہو، اپنی مرضی نہیں کر سکتے۔ اور جنت میں بھی انسان سے مرضی اور ذہنی قوت چھین لی جاتی ہے۔ عورت کو جنت میں بھیج کر نہ صرف فراموش کر دیا جاتا ہے، اس دنیا میں اس سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ غلام بن کر زندگی بسر کرے۔ یہ سب کیا ہے؟

آئیڈیل دینی معاشرے میں بھی ایک آئیڈیل شہری اور کامیاب ایمان یافتہ وہی ہوگا جو خدائی نظامِ حیات کے مطابق روبوٹ کی طرح اپنی زندگی کی پروگرامنگ کر لے گا۔ ایمانی معاشرے میں آزاد نہ غور وفکر اور آزادیِ عمل ختم ہو جاتا ہے۔ ایمان یافتہ فرد کے لیے ضروری ہے کہ

وہ اپنے فکر و عمل کو خدا کی رضا پر چھوڑ دے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدائی نظام کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ عقل ہے اور خدا نے انسان کے لیے یہی علاج تجویز کیا ہے کہ انسان کو اپنی عقل، مرضی اور تخلیقی صلاحیتوں سے محروم کر دیا جائے۔ اگر کٹر مذہبی لوگوں کو دیکھیں تو آپ کو ان کے دو ہی نظام کام کرتے دکھائی دیتے ہیں — ایک سیکس اور دوسرا ہاضمے کا۔ کھانا اور بچے پیدا کرنا، اس دنیا میں ان کے دو ہی کام ہیں، اس کے علاوہ وہ خدا کے پروپیگنڈے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔

پردہ— عورت کی بحیثیت انسان نفی

ہماری روحانی ثقافت عورت سے پردہ کرنے کا مطالبہ شدت سے کرتی ہے، چنانچہ شریعت نے عورت کو سوائے منہ، ہاتھ اور پاؤں کے جسم کا کوئی حصہ ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس میں سر کے بالوں کو بھی چھپانا ضروری ہے۔ جہاں تک عورت کی نقل وحرکت کا تعلق ہے، عورت کو اوّل تو گھر سے باہر ہی نہیں نکلنا چاہیے، لیکن اگر مجبوری سے جانا پڑ جائے تو پردہ کر کے کسی محرم کو ساتھ لے کر جائے۔ یہ ہے وہ نہایت اعلیٰ مقام جو چودہ سو سال پہلے عورت کو دیا گیا تھا۔ پردے کے حکم کا بڑا واضح مطلب عورت کو جنسی وجود (sexual being) قرار دینا ہے اور اس کی ذات کے اقتصادی پہلو سے انکار کرنا ہے۔ پردے کا مطلب ہے، عورت کی ذات کو ہمہ تن، ہمہ وقت، اور ہمہ جہت جنس (سیکس) سمجھا جائے۔ اس کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ اگر عورت کو سوسائٹی میں گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی جائے، تو اس سے پرہیز گار مردوں کے جنسی جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور ان کی اللہ کی طرف سے توجہ ہٹتی ہے۔ اسی لیے طے پایا کہ عورت کو عام انسانی سطح کی سماجی ذمے داریاں اور کردار نہیں سونپا جاسکتا۔

عورت کو پردہ اُڑھا کر اسے یہ احساس دلا دیا جاتا ہے کہ وہ نارمل انسان نہیں، ایک جنسی پتلا ہے۔ اس کا بدن فحش ہے اور اس کا نارمل طریقے سے باہر آنا پاکباز معاشرے کے اخلاق کو خراب کرسکتا ہے۔ جونہی کسی بچی کو پہلی بار پردہ اوڑھنے کو کہا جاتا ہے تو اس کی شخصیت اور سائیکی کو ابنارمل بنانے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس کو جنسی احساس (sex conscience) میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ خواہ اس کی عمر ابھی معصومانہ ہی کیوں نہ ہو، احساس ہو جاتا ہے کہ وہ سیکس کا ایک نشان ہے اور وہ بھی خطرناک۔ اس کی اپنی ذات بھی خطرے میں ہے اور معاشرے کو بھی اس سے خطرہ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بظاہر پردے کے شرعی احکام کے پیچھے حکمت یہ تھی کہ معاشرے کو سیکس کی زیادتی سے بچایا جائے لیکن اس کے لیے جو حل تجویز کیا گیا ہے اس نے عورت کی نفسیاتی حالت، شخصیت اور حیثیت کو تو مسخ کر ہی دیا، خود مردوں کے ذہن کو بھی مستقلاً جنس زدہ کر دیا۔ اب ان پاکباز معاشروں کا حال یہ ہے کہ جب یہاں مرد اور عورت آمنے سامنے آتے ہیں تو وہ خود کو افراد نہیں جنسی پتلے سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ دونوں کے ذہن میں وسوسے، شکوک اور خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس طرح کے پاکباز معاشرے دنیا میں جہاں کہیں ہیں ان کے سب باشندے جنس زدہ ہو چکے ہیں، وہ عورت کو بھوکی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اسے فحاشی بھی قرار دیتے ہیں! ان کے ہاں دو انسانوں کے درمیان عام سماجی ماحول میں نارمل رشتے کا کوئی تصور موجود نہیں۔ مقدس لٹریچر کی ہدایات ان کی نفسیات اور مزاج کو ہر آن متاثر کر رہی ہوتی ہیں۔ اس جیسا معاشرہ اپنے ہی بنائے ہوئے فکری شکنجے میں کس جاتا ہے۔ لوگوں کو اجازت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اور گردوپیش کے بارے میں خود سے رائے قائم کرسکیں۔ انھیں صرف طے شدہ ضابطہ حیات پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ گویا اس سوسائٹی میں انسان خدا کا بنایا ایک ایسا روبوٹ ہے جسے خود سوچنے اور پھر اس کے مطابق فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔

چنانچہ دیکھا جائے تو پردہ انسانوں کے درمیانی فطری اور سماجی تعلق کو مسخ کرتا ہے۔ اگر عورت اور مرد کے بیچ پردہ نہیں ہے تو نارمل معاشرتی ملاقات میں وہ ایک دوسرے کو بطور فرد ملیں گے اور انھیں اپنی جنسی تفریق کا خیال نہیں آئے گا۔ پردہ جنس کو مزید ابھارتا ہے۔ باپردہ عورت زبانِ حال سے کہہ رہی ہوتی ہے، ''میں فرد بعد میں ہوں جنس پہلے ہوں۔'' جب کہ بے پردہ عورت خود کو پہلے فرد سمجھتی ہے اور اپنی جنسی حیثیت کو ثانوی۔ جنسی تعلقات انسانیت کا محض ایک جز ہیں کُل نہیں۔ انسانوں کی بے شمار دلچسپیاں اور متنوع سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ ہر ایک کی اپنی اپنی پسند ہے۔ معاشرتی اور خاندان کے تقاضے ہوتے ہیں۔ ہر کوئی اپنے اپنے حالات میں رہ رہا ہوتا ہے۔ کسی بھی مہذب معاشرے میں یہ توقع کرنا کہ ہر کوئی ہر ایک کے ساتھ جنسی سطح پر تعلق استوار کرلے گا، ایک احمقانہ خیال ہی ہوسکتا ہے۔ انسان (مرد وزن) فکری، تہذیبی اور

ثقافتی سطح پر اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ جنسی تعلق اس کی گونا گوں دلچسپیوں کا محض ایک جز ہے۔ لیکن مذہب چونکہ معاشرے کا سارا تانا بانا جنسی احساس اور تفریق پر استوار کرتا ہے، لہٰذا وہ بات ہی جنس سے شروع کرتا ہے۔ اس کے بارے میں خوف پیدا کرتا ہے، اسے فتنہ قرار دیتا ہے۔ پاکیزگی اور اخلاقیات کے علمبرداروں کے ذہن میں ہر وقت سیکس کا خوف رہتا ہے۔ ان کی نظر انسانی ذات کے دوسرے پہلوؤں کی طرف نہیں جا پاتی، جو لامحدود ہیں۔ اس طرح کا ضابطۂ حیات کوئی با اخلاق معاشرہ تشکیل نہیں دے سکتا، بلکہ انسان کو تہذیبی سطح پر بلند ہونے سے روکے رکھتا ہے۔ سماج کے ترقی کے لیے مرد اور عورت نے فرد کی سطح پر باہمی تعلق قائم کرنا ہوتا ہے، جب کہ شریعت جنس کی سطح پر تعلق کو اجاگر کرتی ہے۔

پردے کے حامیوں کا کہنا ہے کہ یہ عورت کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ یعنی پہلے عدم تحفظ (insecurity) کا احساس پیدا کیا جاتا ہے، پھر اسی کی ذات اور شخصیت کی قیمت پر تحفظ فراہم کر دیا جاتا ہے! سچ یہ ہے، پردہ عورت کے اندر بری طرح سے عدم تحفظ کا احساس پیدا کرتا ہے، ورنہ عدم تحفظ کے بغیر پردے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے، ہماری عورت اپنی اوڑھنی یا چادر کے سرکنے پر اپنی چھاتی سے ملحقہ حصے کو بار بار ڈھکتی رہتی ہے، گویا وہ کسی بھی ماحول میں بیٹھی خود کو نشانہ اور غیر محفوظ سمجھ رہی ہوتی ہے۔ پردہ عورت کے اندر خود اعتمادی کو ختم اور اسے کمزور کرتا ہے۔ پردے کا اصل مطلب عورت کی نکیل کو مرد کے ہاتھ دینا تھا (جیسے اونٹ کی نکیل عرب باشندے کے ہاتھ میں ہوتی ہے)۔ جب برقعے میں ملبوس عورت اپنے مرد کے پیچھے پیچھے چل رہی ہوتی ہے تو اس عورت کو انسان کہنا بڑے دل گردے کی بات ہے!

پردے کا ایک اور مقصد عورت کی جنسی حیثیت کا خاتمہ بھی کرنا ہے۔ یعنی اسے ''غیر جنس'' (asexual) بنانا ہے۔ عورت پر جب پردہ ڈال دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ ''عورت'' نہیں رہی، ایک چیز بن گئی ہے، کپڑے کا چلتا پھرتا ڈھیر، چنانچہ مردوں کے ایمان کو سلامتی کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے! سمجھا یہ جاتا ہے کہ کپڑے کے ڈھیر پر تو للچا نہیں سکیں گے۔ جب کوئی عورت برقع پہن رہی ہوتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے، ''میں اپنے عورت پن کو غائب کرنے لگی ہوں۔'' پردہ اسے ڈھال فراہم کرتا ہے، اس احساس کے آگے کہ اس کا بدن فحش اور دعوتِ گناہ ہے۔ نہ جانے ہمارا روحانی فلسفہ عورت کو ایک مادہ (female) کے طور پر دیکھنا برداشت کیوں نہیں کرتا۔ عورت کے وجود کو اسی وقت قبول کیا جاسکتا ہے جب وہ برقعوں، حجابوں، چادروں اور دوپٹوں سے اپنی جنسی حیثیت کو چھپالے... حالانکہ مرد fetishism اور غیر جاندار اشیا سے جنسی لذت حاصل کرنے کی عادت کا بھی شکار ہو سکتے ہیں۔ مرد عورت کے پہناووں سے ہی حظ اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ برقع ہی ان کے جنسی جذبات کو ابھارنے لگتا ہے۔ فطرت کا عمل کمال کی چیز ہے۔ جو بھی اس کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرتا ہے، سوائے منفی نتائج کے اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جنسی بے راہ روی کو روکنے کے لیے غیر فطری طریقے اپنانے سے مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ ایک زندہ اور باشعور انسانی وجود کے اوپر پردہ ڈال دینا غیر فطری عمل ہے۔ آج کی ترقی یافتہ تہذیب اور طاقتور سائنسی علوم و شعور کے ہوتے ہوئے ازمنۂ وسطیٰ کے ضابطے صرف جبر اور منافقانہ طریقے سے ہی نافذ کیے جاسکتے ہیں۔ سعودی عرب اور ایران کی عورتیں ''عبا'' کے نیچے چونکا دینے والا مغربی لباس زیب تن کیے ہوتی ہیں۔ دبئی، بحرین، قاہرہ کے قحبہ خانوں کے علاوہ یورپ کی گوشت کی منڈیاں، انھی پرہیزگار معاشروں کے دولت مند مردوں سے زندہ ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ پردے سے شرافت آتی ہے تو وہ بھی درست نہیں۔ پابندیوں کے بغیر پلی ہوئی بچیاں زیادہ صاف گو (straightforward) اور شریف النفس ہوتی ہیں، جب کہ سخت پردوں میں پلی لڑکیاں دبی ہوئی شخصیت کی مالک ہوں گی یا پھر اندر کچھ ہوں گی اور باہر کچھ نظر آئیں گی۔ پردہ پوشی عورتوں میں ایک طرح کی مکاری بھی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ عورتیں عام عورتوں سے زیادہ ''گھاگ'' ہو جاتی ہیں اور اپنے باپردہ ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیتی ہیں۔ ان کی جنسی باتوں میں دلچسپی اور معلومات عام عورتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ آج کل جسمانی کاروبار میں ملوث عورتیں پردہ پوشی کے بہانے اپنی شناخت کو مخفی رکھتی ہیں۔ چنانچہ عورت کی آزادی کے لیے اسے پردے سے آزاد کرنا نہایت ضروری ہے، ورنہ ملک کی آدھی آبادی یا تو مکمل ناکارہ ہو جائے گی یا پھر معذور، جو اپنی فطری صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ نہیں کر سکے گی۔

مولانا مودودی کا تصورِ عورت

(ایک تنقیدی جائزہ)

مولانا مودودی کی ایک مشہور کتاب کا نام ''پردہ'' ہے۔اس میں انھوں نے آزادیِ نسواں کے مختلف پہلوؤں پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ان کی حکمتِ عملی یہ رہی کہ اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کرتے ہوئے جدید مغربی دنیا کی مثال اور رویے کو نشانہ بنایا جائے۔اس مسئلے پر جب ہم بحث کرتے ہیں، تو تین چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں — اسلامی نقطۂ نظر، مغربی موقف، اور تاریخ کا ارتقائی عمل۔

اسلامی فلاسفی کو بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں، ''انسان کو شہوانی قوت کو اخلاقی ڈسپلن میں لاکر اس طرح منضبط کرنا ہے کہ وہ آوارگی اور ہیجانی جذبات میں ضائع ہونے کے بجائے ایک پاکیزہ اور صالح تمدن کی تعمیر میں صرف ہو۔'' مولانا لکھتے ہیں، ''اسلامی نظمِ معاشرت میں عورت کے لیے آزادی کی آخری حد یہ ہے کہ حسبِ ضرورت ہاتھ اور منہ کھول سکے اور اپنی حاجات کے لیے گھر سے باہر نکل سکے''۔ یہ فقرہ مولانا انسانی ذات کے لیے استعمال کررہے ہیں، کسی گڑیا، روبوٹ یا حیوان کے لیے نہیں! ان کا کہنا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو خانہ داری کے ماسوا دوسرے امور کی مقید اور مشروط آزادی دی ہے۔وہ مغربی عورت کی سیاسی اور عمرانی سرگرمیوں کا ذکر تضحیک سے کرتے ہیں۔گویا یہ بات طے ہے کہ اسلام میں اصولی اور بنیادی طور پر عورت کے لیے سیاسی و معاشی اور عمرانی سرگرمیاں ممنوع ہیں۔اسے خانہ داری تک محدود رہنا ہے، اور وہ صرف اضطراری حالت میں گھر سے باہر قدم رکھ سکتی ہے، وہ بھی محرم کی موجودگی میں اور سرتاپا کپڑے میں ملفوف ہوکر۔گویا اسلامی طرزِ معاشرت کی حامل بستیاں عورت کے وجود سے خالی ہوں گی۔البتہ کبھی کبھی اور کہیں کہیں کالے یا سفید کپڑے کی چلتی پھرتی بوری نظر آجائے تو اسے عورت سمجھ لیجئے گا۔پاکیزہ اور صالح تمدن کی تعمیر، عورت کی قیمت پر اور ذات کو قربان کرکے حاصل کی جاتی ہے۔

یہاں جدید مسلم دانشور عام لوگوں کے لیے کنفیوژن پیدا کردیتے ہیں۔وہ مولانا کے تصور سے اختلاف کرتے ہیں اور مناسب اطوار میں رہتے ہوئے عورت کی سیاسی و معاشی اور عمرانی سرگرمیوں کو اسلام میں جائز قرار دیتے ہیں۔اس سے ایک عام سامع اور قاری کے لیے الجھن پیدا ہوجاتی ہے کہ کون سا موقف صحیح ہے۔دراصل مولانا اور دیگر مذہبی پیشواؤں کا موقف مذہبی روایات اور مقدس متن کے زیادہ قریب ہے، جبکہ مسلم دانشور محض عصری تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ذاتی اجتہاد سے کام لے رہے ہوتے ہیں۔حقیقتاً اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔وہ محض اپنی طرف سے نکتے نکال کر اسلام کو جدید دنیا کے مطابق بنا رہے ہوتے ہیں، ورنہ زمانۂ جدید سے پہلے اس کی تاویل کبھی نہیں ہوئی، نہ اس طرح اسلام میں کبھی عمل کیا گیا ہے۔استثنائی اور جزوی واقعات سے اسلام کے جدید دنیا کے بارے میں فلسفے کو نہیں بدلا جاسکتا۔مسئلے کا حل جدید دور کے مطابق مذہب کی نئی تعبیریں کرنے یا اسے آج کے مطابق بنانے میں نہیں بلکہ دوٹوک موقف اختیار کرنے میں ہے۔مذہب پرانے تقاضوں اور قدیم تہذیب وثقافت کی پیداوار ہے، وہ آج کے دور کی راہنمائی کے قابل نہیں۔ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں — یا تو ہزاروں سال پرانے طرزِ حیات میں واپس جایا جائے یا اسے خیرباد کہہ کے جدید انسانی فکر کے مطابق اپنی معاشرت کے مسائل حل کریں۔جب تک دوٹوک فیصلہ نہیں ہوتا، عوام کے ذہن ماضی کے شکنجے سے آزاد نہیں ہوسکیں گے۔مولوی اور استحصالی حکمران عوام کو بے وقوف بتانے رہیں گے، چنانچہ عام لوگ حال اور مستقبل کے بارے میں صحیح فیصلہ نہیں کرپائیں گے۔یا تو مذہب کے عین مطابق زندگی گزاری جائے یا سائنسی فکر کو اپنایا جائے؛ سیکولر اور مذہبی نظریات کو مخلوط کرکے کوئی قابلِ عمل سوسائٹی قائم نہیں کی جاسکتی۔ہمارا بحران گہرا ہوتا جائے گا۔جہاں تک مغربی دنیا کا تعلق ہے، مولانا نے سارا زور ان کی جنسی آزادی اور بے راہ روی پر دیا ہے، اور اسلام کو اس کے متبادل نوعِ انسان کے لیے بہترین نظام کے طور پر رکھا ہے۔اب دیکھا جائے تو مغربی تہذیب اگر ایک انتہا کو جاتی ہے تو مولانا دوسری انتہا کو چھو رہے ہیں۔ایک انتہا

کے مقابلے میں دوسری انتہا کو کس طرح قبول کیا جاسکتا ہے؟ مولانا نے جنسی آزادی کے نقصانات پر روشنی ڈالتے ہوئے مندرجہ ذیل نکات واضح کیے ہیں:

جسمانی قوتوں کا انحطاط:

مولانا کا فرمانا ہے: ''شہوانیت کے اس تسلط کا اولین نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فرانسیسیوں کی جسمانی قوت رفتہ رفتہ جواب دیتی چلی جارہی ہے۔ دائمی ہیجانات نے ان کے اعصاب کمزور کر دیے ہیں۔ خواہشات کی بندگی نے ان میں ضبط اور برداشت کی طاقت کم ہی چھوڑی ہے۔'' حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ دنیا میں عالمی ادارۂ صحت (WHO) کی تمام رپورٹوں اور تقابلی جائزے کے مطابق جنسی بے راہ روی کی حامل یورپی قومیں ہم نام نہاد پاکیزہ معاشروں کے افراد سے قابلِ رشک حد تک صحت مند ہیں۔ ان کی فی کس عمر ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمیں نہ صرف پیٹ کی بھوک نے ادھ موا کیا ہوا ہے، بلکہ جنسی بھوک نے علیحدہ سے ساری قوم کو نفسیاتی، جسمانی اور اعصابی مریض بنا رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنسی گھٹن کا ہماری تہذیبی بربادی میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جنسی پابندیوں نے ہم میں اخلاقی گراوٹ پیدا کی ہے، ہماری تخلیقی اور کام کرنے کی صلاحیتوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ مذہبی مدرسے، جیلیں، یتیم خانے، اور فوجی کیمپ ہم جنسی اختلاط کے بڑے بڑے مراکز ہیں۔ ہم اخلاقیات کی علمبردار قومیں کسی بھی لحاظ سے یورپی قوموں سے صحت مند نہیں۔ جہاں تک خبط اور برداشت کی کمی کا تعلق ہے، یہ تو ہمارے مسائل ہیں، نہ کہ ترقی یافتہ قوموں کے۔ ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی لحاظ سے خبطی بھی ہے اور قوتِ برداشت سے عاری بھی۔ آج کی دنیا میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی قوم نے جنسی گھٹن کے ہوتے ہوئے اور زندگی کے معاملات میں عورت کی مساویانہ شرکت کے بغیر ترقی کی ہو۔

خاندانی نظام کی بربادی:

مولانا جنسی آزادی سے خاندانی نظام کے برباد ہونے کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ دراصل کوئی بھی معاشرہ مسائل سے خالی نہیں ہوتا۔ ہر تہذیب انسان کے سامنے کچھ مسائل لے کر آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان کے اختیار میں فیصلہ کرنا ہو تو وہ ان مسائل کا کوئی نہ کوئی حل بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔ اسی طرح یورپی تہذیب کو بھی مسائل درپیش ہیں۔ لیکن چونکہ وہ اپنے ارادہ و فعل میں آزاد ہیں، لہٰذا وہ ان کا کوئی نہ کوئی حل بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ہم جس خاندانی نظام پر اتراتے ہیں، وہ بھی کوئی ایسا قابلِ رشک نہیں۔ ہمارا خاندانی نظام ملکیت، مرکزیت، آمریت اور مردانہ غلبے کے اصولوں پر استوار ہے، جب کہ مغربی خاندان شخصی آزادی، مساوی حقوق، اور یکساں باہمی احترام کے اصولوں پر قائم ہے۔ ہمارے خاندانی نظام میں جو مسائل ہیں ہمیں ان کا حل تو کجا، ذکر کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ ہمارے خاندانی نظام میں جس طرح ایک ان دیکھے لڑکی لڑکے کو شادی کے کھونٹے سے زندگی بھر کے لیے باندھ دیا جاتا ہے اور وہ جس طرح نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزار دیتے ہیں، یہ انسانی تہذیب کا الگ المناک باب ہے۔ قبل از شادی جنسی تعلیم و تربیت نہ ہونے کی وجہ سے متنوع قسم کے الگ مسائل ہیں۔ لڑکیاں اور لڑکے عجیب طرح کے جنسی توہمات کا شکار ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ اپنی ازدواجی زندگی کو غیر مطمئن کر بیٹھتے ہیں۔ ماں باپ کے سامنے بچوں کی حیثیت غلاموں جیسی ہوتی ہے۔ ساری زندگی میں ان کی حاکمیت اور بے جا اثر سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا۔ بچوں کے مستقبل کے بارے میں سب فیصلے بزرگ کرتے ہیں۔ بیوی اور بچے ملکیتی اشیا کی مانند ہوتے ہیں۔ ماں باپ بچوں کو جذباتی طور پر بلیک میل کرتے ہیں۔ اس معاشرے میں طلاق ہو جائے تو عورت کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا؛ وہ ماں باپ یا بھائیوں کے گھر محتاجی اور ذلت کی زندگی گزارتی ہے۔ مغرب میں طلاق یافتہ عورت کے لیے یوں کوئی مسئلہ نہیں کہ وہ پہلے ہی اپنے نان نفقہ کی خود ذمے دار ہوتی ہے۔ اس کی اپنی ملکیت ہوتی ہے، اور پھر دوسری شادی کرنے میں بھی وہاں کوئی مسئلہ نہیں۔ اِدھر طلاق ہوئی اُدھر دونوں نے کہیں اور اپنا نیا ساتھی تلاش کر لیا۔ ہمارے رائج خاندانی نظام میں قربانی کا بکرا بننا یا رشتے کے نام پر دوسرے کا استحصال کرنا عام بات ہے۔ ہمارے خاندانی نظام میں

ساری زندگی ایک دوسرے پر انحصار کرتے گزرتی ہے۔ ہمارے خاندانی نظام میں فرد کچل دیا گیا ہے۔ کثیر الازواجی کا نظام اور بھی تباہ کن اثرات اور تماشا گریوں سے بھرا ہوا ہے۔ ظاہر ہے ایسے نظام کو کسی طور بھی آئیڈیل نہیں کہا جاسکتا۔ دراصل اپنی برائیوں کو چھپانا ہمارا شیوہ ہے۔ ہماری اخلاقیات کی عمارت منافقت کے ستونوں پر کھڑی ہے۔ اندر ہی اندر ہمارے خاندانی نظام میں بھی بہت مکروہ کھیل چلتے ہیں۔ لیکن مغرب اپنے مسائل کھل کر بتا دیتا ہے اور ہم انھیں صحیح تناظر میں دیکھنے کی بجائے اسے پروپیگنڈے کے ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا کا کہنا ہے، ''اس ذہنی اور اخلاقی کیفیت کا اثر ہوتا ہے کہ ہر نسل کی تربیت پہلی نسل سے بدتر ہوتی ہے۔ افراد میں خودغرضی اور خودسری اتنی ترقی کر جاتی ہے کہ تمدن کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔'' حیرت کی بات ہے، مغربی اقوام اس کے باوجود دنیا اور تاریخ پر حکمرانی کیے جارہی ہیں اور شیرازہ نام کی چیز ہم مسلمانوں میں کسی سطح پر موجود نہیں! مغربی اقوام اور سماج تو ہر سطح پر منظّم ہیں۔ یہ بھی ہماری خودساختہ متھ (myth) ہے کہ مغرب میں اولاد ماں باپ کا یا والدین بچوں کا کوئی خیال نہیں رکھتے۔ جو لوگ اپنے پالتو کتے کی ویلفیئر کی خاطر اس قدر بے چین ہو جاتے ہیں، وہ اپنے پیدا کیے ہوئے بچوں سے کس طرح غافل رہ سکتے ہیں؟ چونکہ ہمارے ہاں فرد کی آزادی کا کوئی تصور نہیں، لہٰذا شخصی آزادی پر مبنی مغربی نظام کی خوبیاں ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ جب کہ فرد کی آزادی کی کوئی قیمت نہیں۔ فرد نہیں تو اجتماعیت بے کار ہے۔ جب آپ نے انسان کو ہی کچل دیا تو اس تہذیب اور سماجیات کا کیا کرنا! لیکن ہر چیز اپنی قیمت مانگتی ہے۔ چنانچہ مغربی آزادی نے ان کے لیے کچھ مسائل بھی پیدا کیے ہیں، جس کے منفی اثرات کو متعدد سوشل سیکورٹیاں مہیا کر کے کم کر دیا گیا ہے۔ اور علمی سطح پر بحث مباحثہ بھی جاری رہتا ہے۔ ان کی یونیورسٹیاں تو ہمارے سماجی مسائل پر پی ایچ ڈی سطح کی تحقیق کرواتی رہتی ہیں، جن کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔

نسل کُشی:

اس میں مولانا آبادی کی منصوبہ بندی، استقرارِ حمل اور تولیدِ نسل میں مداخلت کرنے والے جدید سائنسی طریقوں کے عام اور برملا استعمال پر معترض ہوتے ہیں۔ مولانا کے دلائل ملاحظہ فرمائیں: ''اس ذہنیت نے فطرتِ مادری کو اتنا مسخ کر دیا ہے کہ ماں اپنی اولاد سے بیزار، متنفر بلکہ اس کی دشمن ہوگئی ہے۔ مانعِ حمل اور اسقاط سے بچ بچا کر جو بچے دنیا میں آتے ہیں ان کے ساتھ بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔'' اس سلسلے میں وہ کچھ انفرادی مثالیں پیش کرتے ہیں اور پھر مغربی دنیا کے شرحِ پیدائش کے پیہم کم ہونے کو نسل کُشی کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا پیدائش پر کنٹرول ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ اس نے انسان کو آزاد کرنے، اسے ترقی دینے اور اپنے مستقبل پر کنٹرول عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ غیر ضروری بچوں کی پیدائش کو روکنا نسل کشی ہے یا نہیں، اس پر ہم بعد میں بحث کرتے ہیں، البتہ آج بے تحاشا آبادی میں اضافہ ہماری قومی خودکشی کا سبب بن رہا ہے! ہم اپنے ہی بوجھ تلے دب کر مرجانے والے ہیں۔ ذرا اس حشر کا تصور کریں جب پاکستان کی آبادی اکیسویں صدی میں پچاس اور سو کروڑ ہو جائے گی۔ ان لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا، زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے بیٹا دے یا بیٹی، یا اسے بانجھ رہنے دے۔ آج انسان کافی حد تک ان معاملات میں اپنی مرضی کی مداخلت کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے اور دن بدن انسان کا ان کے بارے میں علم اور دخل بڑھتا جارہا ہے۔ جہاں تک زندگی اور موت کا تعلق ہے، انسان کئی بیماریوں پر قابو پا کر، طرح طرح کے علاج اور معجزاتی آپریشنوں کے ذریعے موت کے فرشتے کا کام کافی حد تک کم کر چکا ہے۔ اگر جدید علاج اور وسائل نہ لگائے جائے تو آج بھی لوگ ان امراض سے یقینی طور پر مر رہے ہوتے، اور جہاں یہ علاج میسر نہیں ہیں، وہاں آج بھی مرجاتے ہیں۔ گویا موت کے الٰہیاتی کھاتوں میں ردوبدل انسان کے بس میں ہے، اور جہاں تک زندگی کا تعلق ہے، موت سے بچانا دراصل زندگی دینے کے مترادف ہی ہے۔ آج نہ صرف قبل از پیدائش بچی اور بچے کی شناخت ہو جاتی ہے، بلکہ اپنی مرضی کے مطابق اسے حاصل بھی کیا جاسکتا ہے۔ بانجھ پن کے علاج موجود ہیں۔ ٹیسٹ ٹیوب بچے پیدا ہو سکتے ہیں۔ انسان کی مصنوعی کاپی (کلون) بنائی جاسکتی ہے۔ مستقبل میں اپنی مرضی کی شکلوں اور عادات کے بچے بھی حاصل کیے جاسکیں گے۔ آج انسان کے کافی حد تک بس میں ہے کہ وہ جسے اور جب چاہے پیدا کرے، موت وحیات پر حتمی اور مطلق کنٹرول کا سوال بہرحال الگ ہے۔ اس وقت زیر بحث مسئلہ انسان کا موت وحیات کو اپنی مرضی کے

مطابق ڈھالنے سے ہے جس پر کچھ عرصہ پہلے آسمان کی مکمل طور پر اجارہ داری تھی۔ ان ملاؤں سے سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر صرف اتنے لوگ پیدا ہونے ہیں جتنے خدا نے لکھ رکھے ہیں یا جن کی روحیں بنا رکھی ہیں، تو پھر مانعِ حمل دواؤں کے استعمال کو غیر شرعی کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے کسی روح کو آنے سے نہیں روکا جاسکتا۔ تو پھر لوگوں کو مانعِ حمل ادویات استعمال کرنے کی اجازت کیوں نہیں ہونی چاہیے؟ ورنہ بڑی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوجاتی ہے، یعنی خدا نے تو روح بنا رکھی تھی، لیکن مانعِ حمل دوا کے استعمال سے وہ زمین پر نہ آسکی۔ قیامت کے روز وہ بچ جائے گی اور اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہوگا؟

سچ تو یہ ہے کہ مانعِ حمل ادویات کے ایجاد ہونے سے قدیم جنسی تصورات پاش پاش ہوچکے ہیں اور ان سے متعلق تعزیری قوانین اور نظامِ اخلاق بھی اب مزید استوار نہیں رہ سکتے۔ وقت اور سائنس نے انھیں بے کار ثابت کر دیا ہے۔ زنا کی سزا حمل کی بنیاد پر رکھی گئی تھی، اور اب حمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ باکرہ اور کنواری کا تصور بھی جدید طبی سائنس باطل قرار دے چکی ہے۔ مانعِ حمل ادویات نے عورت کو مردوں کے بنائے ہوئے قدیم سماجی شکنجوں سے آزاد کیا ہے۔ عورت کو حق خودارادی، عزتِ نفس اور مردانہ غلبے سے رہائی ملی ہے۔ ورنہ مردوں نے عورت کو بچے پیدا کرنے والی مشین سمجھ رکھا تھا اور لڑکیاں پیدا کرنے پر اس کی تذلیل کی جاتی تھی۔ مرد جو چاہتا کرتا پھرتا تھا۔ عورت کو چونکہ حمل ہو جاتا تھا لہٰذا اُسے تعزیر کا نشانہ بنایا جاتا اور مرد کو عدمِ ثبوت کی وجہ سے چھوڑ دیا جاتا۔ اگر عورت کو حمل نہ ہوتا، تاریخ میں اس پر جتنے بھی عذاب نازل ہوئے ہیں کبھی نہ ہوتے۔ سائنس نے مرد کو اس معاملے میں نہتا کر دیا ہے۔ اس کے ہاتھ سے یہ استحصالی ہتھکنڈا نکل چکا ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان قانونی مساوات قائم ہوگئی ہے۔ اب عورت اپنی مرضی سے بچہ جنے گی اور مرد اس کے اس اضافی فریضے پر ممنون ہوگا۔ آگے چل کر تو شاید عورت کا یہ بار بھی ختم ہوجائے اور بچوں کی پیدائش کلی طور پر لیبارٹری میں ہی ہونے لگے۔

جنسی معاملات میں آزادی کے بغیر عورت کسی طرح کی بھی آزادی حاصل نہیں کرسکتی، کیونکہ یہ محض جنس ہی تھی جس کی وجہ سے عورت سے اس کا انسانی مقام چھن گیا تھا، اور اسے کمزور صنف قرار دیا گیا تھا۔ مرد نے تمام ملکیت، طاقت اور اختیارات اپنے ہاتھ لے لیے تھے۔ اب عورت کو اپنے بدن پر اختیار ملا ہے اور وہ مرد کی ملکیت اور مرضی سے آزاد ہوگئی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے بچہ پیدا کرسکتی ہے۔ یہ ماں کے دائرۂ اختیار میں ہے کہ وہ بچہ پیدا کرے یا نہ کرے۔ مانعِ حمل ٹیکنالوجی نے جنسی فعل میں پیدائش اور لذت کے عمل کو تاریخ میں پہلی بار الگ الگ کر دیا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ماضی میں مرد اور عورت ایک دوسرے کے قریب زیادہ لذت کی وجہ سے جاتے تھے یا بچے پیدا کرنے کی وجہ سے، لیکن آج سائنس نے یہ سہولت فراہم کر دی ہے کہ آپ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب اپنی ضرورت اور مرضی سے کرسکتے ہیں۔ جنسی اختلاط کی خواہش جبلی ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ فطرت نے اسے صرف بچے پیدا کرنے کے لیے بنایا ہے، ورنہ اس کی خواہش اتنی کثرت سے نہ ہوتی۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس کی خواہش جنم لے سکتی ہے۔ اگر جنس صرف بچے پیدا کرنے کے لیے ہوتی تو حمل ہوجانے کے بعد اس کی مزید خواہش پیدا نہ ہوتی، جبکہ ایسا نہیں ہے۔ مانعِ حمل طریقے فطرت پر انسانی کنٹرول کا قابلِ فخر ثبوت ہیں اور انھوں نے انسانی تہذیب کے ارتقا و ترقی میں عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔

مولانا مندرجہ ذیل نکات پر مغربی تہذیب سے اختلاف کرتے ہیں:

(1) مولانا کا فرمانا ہے کہ مذہب جو طرزِ حیات تجویز کرتا ہے وہ عین فطرت کا مقتضیٰ ہیں۔

(2) انسان کی صلاح اور فلاح اسی میں مضمر ہے۔ مزید برآں اس طرزِ معاشرت میں غایت درجے کی حکمت اور نفسیاتِ انسانی کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ (مولانا نے اس سلسلے میں جو دلائل پیش کیے ہیں وہ صرف مردانہ نقطۂ نظر سے ہیں اور عورت کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔)

مولانا مغربی تہذیب کے مقابلے میں اخلاق، تہذیب، شرافت اور حسنِ سیرت کو اپنا معیار بناتے ہیں، اور عورتوں کو حیا اور عصمت کے زیوروں

سے آراستہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ دراصل یہی زبان اور پرکشش لفاظی ہے جو ہمارے جیسے فیوڈل اور قبائلی اقدار کے عادی لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ تعلیم اور عمومی سائنسی فکر کے فقدان کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے یہ زمین زرخیز ثابت ہوتی ہے۔ اس سے ان کا مقصد حل ہوجاتا ہے کہ جو نظام موجود ہے اس میں کوئی تبدیلی نہ آنے پائے۔ اس ''اخلاق، تہذیب، حیا اور عصمت'' کے اندر جو منافقتیں، دوہرے معیار اور ظلم و ناانصافی کی داستانیں پوشیدہ ہیں، ان کا کوئی ذکر نہ کیا جائے۔ اسی لیے مولانا فرماتے ہیں کہ مسلم تاریخ ان ''اعلیٰ اقدار'' پر ساڑھے تیرہ سو سال کے زبردست امتحان پر پوری اتری ہے۔ لیکن اس صالح اور پاکیزہ تمدن میں سینکڑوں سال تک لونڈیوں کی جو منڈیاں لگتی تھیں، ایک ایک شخص کی لونڈیوں اور بیویوں کی تعداد سینکڑوں میں جاتی تھی، کہیں کہیں اور کبھی کبھی متعہ یعنی عارضی نکاح کا رواج بھی رہا، مسلم تاریخ کی اہم شخصیات بکثرت طلاق سے درجنوں بیویاں اپنی زندگی سے فارغ کرتی رہی ہیں، مالِ غنیمت میں عورتوں کو اٹھانا اور انھیں باہم دیگر مال و متاع کی طرح تقسیم کرنا اور بچوں کو غلام بنا کر فوجی کیمپوں میں بھیج دینا، ایک دوسرے کو تحائف میں عورتیں پیش کرنا بھی اس صالح تاریخ کا حصہ ہیں۔ برصغیر کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کا طبقۂ اشرافیہ پیشہ ور عورتوں کے کوٹھوں سے بھرا رہتا تھا، جب کہ گھر میں چار چار بیویاں الگ پڑی ہوتی تھیں۔ پوری اسلامی تاریخ میں عورت تعلیم اور کسی بھی طرح کے سماجی کردار سے محروم رہی ہے۔ حیا اور شرافت کے نام پر صدیوں تک عورت کو معذور اور چار دیواری میں مقید رکھا گیا ہے اور سب ملاؤں کی آج بھی یہی خواہش ہے۔

اب ہم مولانا کی دلیل نمبر ایک پر بحث کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فطرت نے تمام انواع کی طرح انسان کو بھی ''زوجین'' پیدا کیا ہے۔ یہ بات حقائق کے خلاف ہے کہ سب انواع میں جوڑے پائے جاتے ہیں۔ فطرت نے بہت سی انواع یک صنفی بھی پیدا کی ہیں۔ دوسرے مولانا جب فطرت کی خصوصیات کی بات کرتے ہیں تو وہ لفظ ''رکھ دی ہیں'' استعمال کرتے ہیں، جیسے انھیں فطرت کے اندر ''رکھ'' دیا گیا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب فطرت کی بات کی جائے تو اسے صحیح طور پر سمجھنے کے لیے سائنسی رویہ ضروری ہے، اپنے پاس سے باتیں نہیں بنائی جاسکتیں، اور سائنس یہ کہتی ہے کہ فطرت کے اندر پائے جانے والے میلانات، قوتیں اور جبلتیں، اشیا کے بننے کے ارتقائی عمل کے دوران اندرونی اور بیرونی اثرات کے زیر اثر کروڑوں سال میں تشکیل پائی تھیں، انھیں کسی مخصوص وقت میں ''رکھا'' نہیں گیا تھا جیسا کہ مولانا کا خیال ہے۔ ''رکھا گیا'' کا تصور ارتقا کی نفی کرتا ہے۔ مولانا کو فطرت کے اندر جو ''مقاصد'' نظر آتے ہیں، وہ بھی محض انسان کا اپنا واہمہ ہے، اس لیے کہ جب وہ چیزوں کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتا ہے تب اسے ان میں ''مقاصد'' نظر آتے ہیں۔ ورنہ حیوانات ہوں یا نباتات، سورج چاند ستارے ہوں یا دیگر سیارے، سب کا اپنا اپنا آزاد نہ وجود ہے۔ وہ ایک دوسرے سے منسلک ضرور ہیں لیکن محض کسی کا ''مقصد'' پورا کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ گھوڑا اس لیے نہیں پیدا ہوا تھا کہ ہم اس پر سوار ہوں، یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ہم نے اسے سواری کے لیے استعمال کرلیا۔ گھوڑے بے چارے کو تو پتا بھی نہیں تھا کہ اس کا یہ استعمال ہونا ہے۔ گھوڑے کی تخلیق فطرت کے خود مختار قوانین اور اسباب کے تحت ہوئی تھی۔ حقیقت بھی یہی ہے اور سائنس کا موقف بھی یہی ہے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ یا تو مغربی تہذیب کو اپنا لو یا اسلام کو۔ ہمارا یہ کہنا ہے کہ آج کے دور میں ہم کھلی حقیقتوں کی حامل سائنس کو اپنائیں یا ملاؤں کی بتائی ہوئی غیر حقیقی اور خود ساختہ روایتوں کو۔

مولانا کا فرمانا ہے، عورت کی فطرت میں صنفی کشش کے ساتھ شرم و حیا اور تمانع اور فرار اور رکاوٹ کا مادہ ''رکھا'' گیا ہے۔ انسان کے بچے کے کمزور، بے بس اور کئی سال تک ماں باپ کی حفاظت کے محتاج ہونے کا ''مقصد'' یہ ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلق کے علاوہ بھی رشتہ قائم رہے۔ حیوانات ایک 3/4 مدت کے بعد اپنے بچوں سے جدا ہوجاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں، جب کہ انسان ابتدائی پرورش کے بعد بھی اولاد کی محبت میں گرفتار رہتا ہے۔ یہ تمام باتیں مولانا اس مفروضے پر کررہے ہیں جیسے یہ تمام خصوصیات روزِ اوّل سے ہی انسان میں موجود تھیں، جب کہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔ ایک وقت تھا جب انسان بھی اپنی اولاد کو رشتوں کے حوالے سے پہچانتا نہیں تھا، باپ اپنی بیٹی اور بھائی اپنی بہن سے جنسی رشتہ جوڑ لیتا تھا۔ پہچاننے کا عمل کہ کون کیا ہے، ہزاروں سال کے سماجی ارتقائی عمل میں وجود میں آیا، ورنہ انسان نے لاکھوں سال اولاد کی پہچان اور اس کی تربیت کا بطور ماں باپ فریضہ لیے بغیر گزارے ہیں۔ اسی طرح عورت کے اندر یہ شرم و حیا آسمان سے ودیعت نہیں ہوئی تھی، یہ نفسیاتی کیفیت ہزاروں سال کے مخصوص سماجی ماحول میں پیدا ہوئی ہے اور اس

سے برعکس ماحول کی تربیت اس کا خاتمہ کردے گی۔ دراصل لوگوں کی سادہ فہمی اور لاعلمی سے فائدہ اٹھا کر مذہب کے نام پر غیر سائنسی افکار پھیلائے جاتے ہیں۔ خاندان (family) کا تصور تو چند ہزار سال بھی پرانا نہیں، جب کہ انسان اس کرۂ ارض پر کروڑوں سال سے رہ رہا ہے۔ مولانا کے سارے تھیسس کی بنیاد ہی باطل ہوجاتی ہے۔ وہ جن خصوصیات اور جس ترتیب اور تنظیم اور رنگ و بو کو آج دیکھ رہے ہیں، ان کا خیال ہے کہ ایسا ہمیشہ سے ہی تھا اور یہ سب کچھ فکسڈ (fixed) ہے۔ اسے ایسا خاص مقصد سے ''رکھا'' گیا ہے۔ حالانکہ جو سامنے ہے وہ ہمیشہ سے نہیں ہے، وہ ارتقائی پراسس (process) میں وجود میں آیا تھا اور آج بھی تغیر و تبدل کا شکار ہے۔

اب مولانا اس ''اہم'' سوال کی طرف آتے ہیں کہ عورت اور مرد کے درمیان صنفی کشش اور میلان کو کس طرح قابو کیا جائے، اس لیے کہ انسان حیوانی عنصر اگر اس پر پوری طرح غالب ہوجائے تو وہ انسانیت اور اس کے تمدن دونوں کو کھا جائے گا۔ مولانا کا فرمانا ہے کہ ''شہوانیت میں حد سے تجاوز کرنے سے تسکیں کمزور ہوجاتی ہیں، جسمانی اور ذہنی قوتوں کی نشو و نما رک جاتی ہے، اور اسی لیے مغربی تہذیب تباہی کی طرف جارہی ہے۔ یہ کیا چیز ہے کہ سوسائٹی میں عورت کو عورتوں سے زیادہ مرد کی صحبت اور مرد کو مردوں سے زیادہ عورتوں کی معیت مرغوب ہے ؟'' مولانا نہ جانے کس تباہی کی بات کررہے ہیں۔ ابھی تک حقیقت یہ ہے کہ مغربی اقوام مادی، جسمانی اور ذہنی قوتوں کے لحاظ سے قابلِ رشک زندگی گزار رہی ہیں، اور ہم جیسی پسماندہ اقوام نہ صرف ہر چیز کے لیے مغرب کے محتاج ہیں، بلکہ اب تو ہمیں اپنی بقا کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ جہالت ہمیں تباہی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ مولانا کی دلیل کے برعکس مغربی اقوام کی ترقی کا راز ہی یہ ہے کہ وہ سیکس کے مسئلے سے فارغ ہوچکے ہیں، جبکہ ہمارا ذہن سیکس کی سوچ کے سوا کسی اور تخلیقی کام کے لیے تیار ہی نہیں۔ ہماری ثقافت، تہذیب، نظام اخلاقیات کو صرف ایک ہی سوچ کنٹرول کررہی ہے اور وہ ہے سیکس۔ مغربی لوگوں کی جنسی سرگرمیاں ان کے جنسی اعضا تک محدود ہیں، لیکن ہمارا کوئی علاج نہیں، اس لیے کہ جنسی سرگرمی ہمارے اذہان اور ہماری سوچوں پر قبضہ کرچکی ہے۔ مولانا صاحب کی یہ خواہش بھی بڑی غیر فطری ہے کہ عورت کو عورتوں کی صحبت میں اور مرد کو مردوں کی صحبت میں خوش رہنا چاہیے! فطرت نے عورت کو مرد کے لیے اور مرد کو عورت کے لیے ہی بنایا ہے اور صحبت کی یہی نوعیت فطرت کے عین مطابق ہے۔ مولانا کو اگر عورت مرد کی صحبت میں خطرات دکھائی دیتے ہیں تو عورت عورت اور مرد مرد کی صحبت میں بھی ''خطرات'' موجود ہیں۔ وہاں بھی ہم جنسیت کا کھاتا کھل سکتا ہے۔ پاکیزگی کے قائم رہنے کی ضمانت تو اس میں بھی نہیں ہے۔

مولانا بار بار ''فطرت کی منشا اور مطالبے'' کا ذکر کرتے ہیں، حالانکہ وہ سب باتیں فطرت کی بجائے ہمارے تہذیبی عمل کا نتیجہ ہیں اور تہذیب انسان کی اپنی بنائی ہوئی اور قابلِ تغیر ہے۔ وہ فطرت اور نیچر کے نام پر عورت کو مختلف حیلے اور بہانے سے گھر میں بٹھانا چاہتے ہیں۔ اب وہ بچے کے پیدائشی مراحل اور پھر اس کے طویل عرصے تک نگہبانی کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ مغرب میں عورت کے تمام سماجی سرگرمیوں میں شرکت کے باوجود یہ سب کام بخوبی انجام پارہے ہیں۔ انھیں اس میں کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں ہے، ورنہ ان کا تہذیبی عمل کب کا رک جاتا اور انھیں کوئی اور لائحۂ عمل اختیار کرنا پڑتا۔ وہ قومیں اپنی جگہ پر خوش باش ہیں۔ وہاں کے بچوں کو ہم سے زیادہ اعلیٰ پرورش اور تعلیم و تربیت کے وسائل میسر ہیں اور ماں باپ کا پیار بھی کسی طرح کم نہیں۔ ہم لوگوں نے یہاں بیٹھ کر ان کے بارے میں خود ساختہ کہانیاں بنا رکھی ہیں۔ ہم یہاں پر یہ بات پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ جہاں تک مسائل کا تعلق ہے، کوئی بھی تہذیب مسائل سے مبرا نہیں، لیکن انسانیت کے لیے وہ تہذیب سودمند اور قابلِ ترجیح ہوگی جو انسان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ مشرقی تہذیب کی نہ صرف سب خوبیاں خیالی ہیں بلکہ اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ آج ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن چکی ہے۔

مولانا کو فنونِ لطیفہ میں بھی سوائے جنس کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بقول ان کے، ''ہمارے سنیما، ہمارے لٹریچر، ہماری تصویروں، ہماری موسیقی اور اس مخلوط سوسائٹی میں بنی ٹھنی عورتوں کا مردوں سے سامنا ہونے سے شہوانی ہیجان غیر معمولی اعتبار سے بڑھ جاتا ہے، ورنہ ایک پر سکون فضا میں عام عورتوں اور مردوں کا ایسا ہیجان کبھی لاحق نہیں ہوتا۔'' حیرت کی بات ہے کہ جس طرح کا پرسکون فضا والا صالح معاشرہ مولانا تجویز کرتے ہیں، پھر اس میں مردوں کو کیوں سینکڑوں لونڈیاں اور چار چار بیویاں رکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اصل بات صالح تمدن کی

نہیں؛ فنونِ لطیفہ میں جنس زدگی کی تلاش کا مطلب ہے کہ جمالیات کو مٹایا جائے، تاکہ انسان کے اندر سے لطافت کا خاتمہ ہو اور اسے خوب صورتی کی طرف متوجہ ہونے سے روکا جائے، خواہ وہ کسی شکل اور ہیئت میں ہو۔ یہ حضرات فنون اور آرٹس میں لوگوں کی فطری محبت سے جل بھن جاتے ہیں۔ ان ایک ہی خواہش ہے کہ لوگ ہر وقت پوجا پاٹ میں مصروف رہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ سخت مذہبی لوگ اپنے حلیے اور لباس کی وضع کو زیادہ سے زیادہ بدنما کر کے خود کو خدا کے مقربین میں شمار کرتے ہیں!

انسدادِ فحاشی کی تدابیر میں لٹھ بازی اور دیگر فاشسٹ طریقے ان کے کارکنان کے ہاں سرفہرست ہیں، لیکن مولانا احساسِ گناہ کے پیدا کرنے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس لفظ ''گناہ'' کا تجزیہ بھی ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ گناہ ایک خیالی، تجریدی اور مہمل تصور ہے۔ اگر کسی کو کہا جائے کہ وہ لفظ ''گناہ'' کی تعریف (definition) کرے تو بہت مشکل ہو جائے گا یہ بتانا کہ آخر گناہ کسے کہتے ہیں؟ یہ سادہ زمانوں کی باتیں تھیں جب مصلحین گناہ وثواب جیسے غیر واضح الفاظ سے لوگوں کو اپنے وقت کی برائیوں سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ گناہ کا تصور تو ہم پرستی کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں عمل گناہ ہے، تو اس میں عقلی تجزیہ شامل نہیں ہوتا، اس کی بنیاد محض اندھا وہم ہوتا ہے۔ ضروری نہیں ہر گناہ سچ مچ کوئی ایسا جرم ہو جس سے آپ کو یا کسی دوسرے کو کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ آج انسان کا شعور زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ احساسِ گناہ پیدا کیے بغیر وہ مسائل کو سائنسی سطح پر سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر کوئی کام کرنا ہے تو کیوں کرنا ہے، یا اگر نہیں کرنا ہے تو کیوں نہیں کرنا ہے۔ اگر کوئی برا فعل بھی ہے، تب بھی اس کا مکمل تجزیہ، عمل اور ردِّ عمل اور اس کے نتائج وعواقب سے آگاہی خوفِ گناہ سے کہیں زیادہ کارگر ہو سکتا ہے۔ اس میں انسان کی خود اختیاری قائم رہتی ہے۔ وہ اپنے عمل اور اس کے نتائج کی ذمے داری پورے شعور کے ساتھ قبول کرتا ہے اور اس میں انسان کی ذہنی صحت بھی برقرار رہتی ہے، ورنہ خوفِ گناہ ذہنی مریض بنا دیتا ہے۔ چونکہ گناہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے اس کا فیصلہ خود فرد نہیں کرتا بلکہ خارجی اتھارٹی کرتی ہے، چنانچہ یہ مذہبی پیشوا کی صوابدید پر ہوتا ہے کہ وہ کس عمل کو گناہ قرار دے دے اور تابعین کو اسے بلا سوچے سمجھے قبول کر لینا ہوتا ہے۔ گویا گناہ کی تھیوری میں شعور کا خانہ خالی کرنا پڑتا ہے اور اپنے افعال واعمال کسی خارجی اتھارٹی کے رحم وکرم پر چھوڑنے ہوتے ہیں، اور پھر یہ مذہبی پیشوا لوگوں کے ذہنوں اور دلوں پر اپنی من مرضی سے حکمرانی کرتے ہیں۔ صحیح اور غلط کیا ہے، اس کی ذمے داری انسان کے انفرادی اور اجتماعی شعور پر عائد ہوتی ہے، جس کے پیمانے زمان ومکان کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ گناہ وثواب کا چکر محض لوگوں کے ذہنوں کو کنٹرول میں لینے کے لیے تھا۔ یہ زمانہ سائنس اور جمہوریت کا ہے۔ ہر بات کا فیصلہ علمی بنیاد اور جمہوری اسپرٹ کے ساتھ کرنا وقت کا تقاضا ہے۔

مولانا کو جب یہ دلیل دی گئی کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان حجابات حائل کرنا اور معاشرت میں ان کے آزادانہ اختلاط پر پابندیاں عائد کرنا دراصل سارے معاشرے کے اخلاق اور سیرت پر حملہ ہے اور ایسی پابندیاں لگانے والوں کو نہ اپنی عورتوں پر اعتماد ہے نہ مردوں پر، تو وہ اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں: ''ہر قفل جو کسی دروازے پر لگایا جاتا ہے، گویا اس امر کا اعلان ہے کہ اس کے مالک نے تمام دنیا کو چور سمجھ لیا ہے۔ ہر پولیس مین کا وجود اس پر شاہد ہے کہ حکومت اپنی تمام رعایا کو بدمعاش سمجھتی ہے، ہر لین دین میں جو دستاویز لکھوائی جاتی ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ ایک فریق نے دوسرے فریق کو خائن قرار دے دیا ہے۔'' مولانا کو متبادل دلائل کا اپنے حق میں موڑنے کا خوب فن آتا ہے اور پھر سہولت یہ ہے کہ سامنے ایسے سامعین ہوتے ہیں جو اپنے ذہن وشعور کو پہلے ہی ان کے زانو پر رکھ چکے ہوتے ہیں۔ مولانا کی پہلی مثال لیجیے، جب آپ قفل لگاتے ہیں، ظاہر ہے آپ ساری دنیا کو چور قرار نہیں دے رہے ہوتے اور اسی لیے دنیا بھی اسے اپنی عزتِ نفس کا سوال نہیں بناتی۔ آپ صرف امکانی چور سے محفوظ ہونے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی جسے آپ قفل لگا رہے ہوتے ہیں وہ پلٹ کر آپ کو کہتی ہے کہ تم مجھ پر قفل کیوں لگا رہے ہو، اس لیے کہ وہ ایک بے جان چیز ہے اور آپ اس کے مالک ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ عورت پر بھی پابندیاں اسی لیے عائد کی جاتی ہیں کہ اسے کسی امکانی مفسد سے بچایا جائے۔ لیکن اس تقابل میں بہت بڑی چیز جو نظر انداز کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ عورت کوئی بے جان چیز نہیں ہے جس پر آپ ''قفل'' لگا رہے ہیں، اور نہ ہی آپ اس کے ''مالک'' ہیں۔ وہ جیتی جاگتی اور صاحبِ شعور انسانی ذات ہے۔ آپ کو کیا حق پہنچتا ہے اس پر قفل لگانے کا، اور بلاوجہ اس پر اعتبار نہ کرنے کا؟ ایسا کیوں تجویز نہیں کیا جاتا کہ قفل

مردوں پر لگا دیا جائے تا کہ وہ معاشرے میں کوئی فساد برپا نہ کر سکیں اور عورتوں کی عزتیں محفوظ رہیں؟ دراصل ان کے سارے فلسفے اور ایمان کی بنیاد ہی عورت کو غیر جاندار ''شے'' اور مرد کو اس کا ''مالک'' سمجھنا ہے، اسی لیے یہ بلا سوچے سمجھے اس طرح کی مثالیں اور دلائل پیش کر جاتے ہیں۔ مولانا کے دیگر دلائل میں بھی عورت کو ایک شے کے مشابہ سمجھا گیا ہے۔ ہمارا مولانا سے اختلاف اور جھگڑا صرف اسی نکتے پر ہے کہ ہم عورت کو انسان سمجھتے ہیں اور وہ ایک چیز!

اب مولانا ''تعلقِ زوجین کی صحیح صورت'' پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے حقوق ٹھیک ٹھیک عدل سے مقرر کیے جائیں، ان کے درمیان ذمے داریاں مناسبت کے ساتھ تقسیم کی جائیں اور خاندان میں ان کے مراتب اور وظائف کا تقرر اس طور پر ہو کہ اعتدال اور توازن میں فرق نہ آنے پائے۔ یہ لوگ عدل، اعتدال، توازن اور وظائف کی باہمی تقسیم جیسے الفاظ استعمال کر کے صدیوں سے عورت کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ ایک فریق کو گھر پر بند کر دیا اور دوسرے کو آزاد اور کھلا چھوڑ دیا— یہ کس طرح کا اعتدال اور توازن ہے؟ مرد کو چار عورتیں دے دیں اور عورت کو ایک چوتھائی مرد، ایک فریق کو ملکیت سے محروم کر دیا (عورت کمائے گی نہیں تو اس کی ملکیت کہاں سے آئے گی؟) اور اس کی تخلیقی صلاحتیوں کو بچے سازی تک محدود کر دیا اور دوسرے فریق کو غلبے اور ملکیت کے تمام ذرائع فراہم کر دیے۔ یہ ہے عدل! مرد اور عورت کو آقا وغلام، غالب ومغلوب، فاعل اور مفعول کے رشتے میں باندھ کے اعتدال اور توازن کا نام دے رہے ہیں۔ مولانا مرد اور عورت کے درمیان جو توازن تجویز کرتے ہیں وہ معکوسی رشتے کا توازن ہے، مساواتی رشتے کا نہیں۔ جہاں تک مولانا کی اس دلیل کا تعلق ہے کہ تاریخی معلومات کے ریکارڈ میں کسی ایسی قوم کا نشان نہیں پایا جاتا جس نے عورت کو حاکم بنایا ہو، پھر دنیا میں عزت اور طاقت حاصل کی ہو یا کوئی کارِ نمایاں انجام دیا ہو۔ تو اس سلسلے میں عرض ہے، دورِ جدید کی یورپی تہذیب مرد عورت کے درمیان مساوات رکھ کر سائنس اور ٹیکنالوجی کے اعلیٰ ترین کارِ نمایاں انجام دے رہی ہے۔ اور عورتوں کو گھر کی ملکہ بنانے والے معاشرے ان اقوام کی غلامی کر رہے ہیں اور اپنی بربادی کا خود ہی منھ بولتا ثبوت ہیں۔ اور اگر ان لوگوں کو تاریخ میں جھانکنے کی توفیق ہو تو انسانی تہذیب کے اوّلین معاشرے مادرسری نظام پر مشتمل تھے یعنی عورت خاندان اور قبیلے کی سربراہ ہوتی تھی۔ زراعت عورت کی ہی ایجاد ہے جس نے انسان کو تہذیب اور تمدن سے آشنا کیا تھا، ورنہ یہ مرد وحشی اور شکاری کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ تاریخی عوامل نے ایسا پلٹا کھایا کہ مرد نے ملکیت پر قبضہ کر لیا اور عورت کے فرائض کو خانہ داری تک محدود کر دیا۔ لیکن نہ مادرسری نظام حرفِ آخر تھا اور نہ پدرسری نظام، دونوں نے اپنے اپنے حالات میں تاریخ کو آگے بڑھنے میں مدد کی اور اب وہ مقام آ گیا کہ تاریخ کی باگیں مرد اور عورت دونوں نے یکساں تھام لی ہیں۔ جن عوامل کی وجہ سے مادرسری اور پدرسری نظام بنے تھے وہ دونوں ہی نابود ہو چکے ہیں۔ یہ خواہ مخواہ مذہب کے نام پر وقت کو پیچھے لے جا رہے ہیں اور تاریخ کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ مولانا مغربی تہذیب کی خیالی فساد آرائیوں پر صفحے کے صفحے کالے کرتے جاتے ہیں۔ اگر وہ تہذیب کسی سچ مچ جنسی فساد میں مبتلا ہوتی تو وہ معاشرہ ابھی تک ڈھیر ہو چکا ہوتا، حالانکہ وہاں جتنا عدل، امن، سکون، ڈسپلن، اقدار کی پاسداری، قانون کی عملداری اور حقوق وفرائض کا توازن ہے، ہم صالح قومیں اس کا تصور نہیں کر سکتیں۔ اور سب سے بڑی بات، فرد بھی آزاد ہے، جب کہ مولانا جو نظامِ معاشرت تجویز کرتے ہیں، اس میں ایک فریق (عورت) تو بالکل ہی کچل دیا جاتا ہے اور دوسرا (مرد) روبوٹ بن جاتا ہے۔

مولانا کے تھیسس میں مردوں اور عورتوں کو فریب دینے کا عمل ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ بلند بانگ لفاظی میں لکھتے ہیں، ''اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان ہونے میں مرد اور عورت دونوں مساوی ہیں، تمدن کی تعمیر اور تہذیب کی تاسیس وتشکیل اور انسانیت کی خدمت میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ ہر صالح تمدن کا فرض یہی ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اپنی فطری استعداد اور صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع دے۔ انھیں بھی مردوں کی طرح تمدنی ومعاشی حقوق عطا کرے اور انھیں معاشرت میں عزت کا مقام دے،'' وغیرہ وغیرہ۔ عورت کو کھوکھلے الفاظ سے بہلایا جاتا ہے، اس لیے کہ جب عملی تصویر سامنے آتی ہے، تو یہ سب کچھ تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے اور مولانا فوراً ہی یہ سوال اٹھا دیتے ہیں: ''کیا فطرت کا یہ مقصود ہے کہ دونوں پر ایک جیسی خدمات کا بار ڈالا جائے؟'' مولانا کے خیال کے مطابق ایک جیسی ذمے داریاں ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کے نظامِ جسمانی بھی یکساں ہوں! اس کے بعد وہ زور دیتے ہیں کہ

فطرت نے عورت کا جسم بچہ جننے اور اس کی پرورش کے لیے بنایا ہے۔ گویا تھوڑی دیر پہلے مردوں کی طرح عورتوں کی فطری استعداد اور صلاحیت کو جو زیادہ سے زیادہ ترقی کی وکالت ہو رہی تھی، اس کا مطلب عورت کی ہمہ گیر ترقی نہیں محض بچے جننے کی استعداد میں ترقی تھی! پھر مولانا ایام ماہواری کے دوران عورت کی طبیعت پر جو ضمنی اثرات پڑتے ہیں ان پر اپنی کتاب کے کئی صفحے کالے کرتے ہیں، تاکہ عورت کو کسبِ معاش کے لیے ناکارہ ثابت کیا جائے۔ ان کے نزدیک عورت کو ماہواری، حمل، رضاعت، بچے کی پرورش اور نگہداشت کے چکر سے فرصت نہیں مل سکتی۔ ظاہر ہے، ایک بچے سے فارغ ہونے پر کباز مرد اسے فرصت ہی کب دے گا، فوراً دوسرا بچہ پکڑا دے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر عورت کسبِ معاش کے لیے فطری طور پر ناکارہ ہے تو پوری ترقی یافتہ دنیا میں عورت ہر طرح کی سماجی، فنی، تفریحی اور معاشی سرگرمی میں کیوں کر مصروف ہے؟ مولانا سماجی میدان سے عورت کو بے دخل کرنے کے لیے ''فطرت'' کو مسلسل اپنی ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ پہلی بات مولانا کو یہ سمجھنی چاہیے کہ انسان جانور نہیں جو تمام تر زندگی ''فطرت'' کے عین مطابق گزارے۔ انسان نے فطرت کی کئی چیزوں کو توڑا ہے اور اس میں انسانی ساختہ تہذیب کا رنگ بھرا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں عورت کا کام بچے پر بچے جنتے اور انھیں پالتے رہنا ہے۔ مولانا فطرت کے نام پر عورت کو جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر کیوں مجبور کرنا چاہتے ہیں؟ آج کا ترقی یافتہ انسان ایک دو بچوں سے زیادہ جننے کا قائل نہیں ہے۔ جدید طبی سہولتیں اور اعلیٰ معیار کی صحت کے وسائل کی وجہ سے عورت بچے کی پیدائش کے فوری بعد ہر طرح کے فرائض ادا کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اب تو بچے کی پیدائش کے لیے عورت کا ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ تب مولانا کی ''فطرت'' کہاں جائے گی؟

سب مذہبی پیشوا حقوقِ نسواں پر بحث کرتے ہوئے بظاہر عورت کے بڑے ''ہمدرد'' اور ''عدل و انصاف'' کے پیروکار بن جاتے ہیں۔ انھیں بڑا دکھ ہوتا ہے کہ عورت بے چاری ہر تیسرے ہفتے ماہواری کا شکار ہو جاتی ہے، نو ماہ کے حمل اور بعد از حمل کا پورا ایک سال ''سختیاں'' جھیلتے گزارے اور پھر بچے کی پرورش کے لیے اپنی راتوں کی نیندیں اور دن کا آرام حرام کرے اور اس کے بعد اسے روزی کمانے کی مشقت پر بھی لگا دیا جائے، یہ بہت بڑا ''ظلم'' ہے، چنانچہ عورت کو مردانہ کاموں کے لیے تیار کرنا عین اقتضائے فطرت اور وضعِ فطرت کے خلاف ہے۔ چونکہ علم الحیات کی رو سے عورت کو بچے کی پیدائش اور پرورش کے لیے بنایا گیا ہے، چنانچہ اسے نفسیاتی طور پر بھی انفعالی کاموں کے لیے بنایا گیا ہے۔ جن کاموں کے لیے ''شدت، تحکم، مزاحمت اور سرد مزاجی چاہیے، ان میں عورت کو گھسیٹ لانا خود اس کو بھی ضائع کرنا ہے۔'' دراصل مولانا کے نزدیک عورت کا صرف ایک ہی روپ ہے اور وہ ہے مری، پگلی، دبی ہوئی عورت، اور ان کے خیال میں ایسی عورت ہی ''فطرت کے عین مطابق'' ہے۔ مولانا نے واضح طور پر لکھا ہے کہ عورت کو سپہ سالار، مدبر اور منتظم بننے کی بجائے صرف اچھی ماں، اچھی بیوی اور اچھی خانہ دار ہی بننے کی کوشش کرنی چاہیے، ورنہ تمدن کا نقصان ہوگا۔ خاندان کے لیے روزی کمانا، اس کی حفاظت کرنا اور محنت طلب معاشرتی خدمات انجام دینا مرد کا کام ہے۔ بچوں کی پرورش، خانہ داری اور گھر کو (مرد کے لیے) سکون و راحت کی جنت بنانا عورت کا کام ہے۔ حتیٰ کہ مولانا کا ارشاد ہے کہ جس رکن کی ''دماغی اور قلبی'' حالت بار بار ایام ماہواری اور حمل میں بگڑ جاتی ہو، وہ اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ حد یہ ہے کہ مولانا اپنا مذکورہ بالا تھیسس ''خاص علمی تحقیق اور سائنسی مشاہدات و تجربات'' کی مدد سے نکالا ہوا بتاتے ہیں! مذہبی پیشوا ''علم، سائنس اور تحقیق'' کو کیسے بگاڑ کر جہالت میں ملفوف کر سکتے ہیں، یہ اس کا واضح ثبوت ہے۔ ظاہر ہے اندھی عقیدت رکھنے والے پیروکاروں کی سمجھ بوجھ کو پہلے سے ہی بند کر دیا گیا ہوتا ہے۔

یہ طے ہو جانے کے بعد کہ عورت کا فریضۂ منصبی صرف بچے پیدا کرنا، ان کی پرورش کرنا اور مرد کی راحت کا باعث بننا ہے، اور اس تقسیم میں مردوں کا کوئی قصور نہیں، بلکہ یہ فرق فطرت کا پیدا کردہ ہے، مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ عورت کا مکمل طور پر قبضہ پاک کرنے کے لیے ابھی اور ''فطری'' ہتھیاروں کی ضرورت ہے۔ اب مولانا عورت کے اندر فطرت نے جو شرم و حیا کا مادہ رکھ چھوڑا ہے، اس کی طرف آتے ہیں۔ اسے مولانا عورت کی بہترین صفت قرار دیتے ہیں۔ مولانا فلسفۂ زوجیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں، ''مرد اور عورت زندگی کے دو مساویانہ ساتھی نہیں، بلکہ زوجین میں سے ایک میں قوتِ فعل ہے اور دوسرے میں قوتِ انفعال۔ ایک برتر ہے اور دوسرا ماتحت، ایک کرنے والا ہے اور دوسرا کروانے والا، ایک دینے والا ہے اور دوسرا قبول کرنے والا۔ اب مولانا فرماتے ہیں کہ فاعل کو مفعول پر فضیلت ہے اور یہ فضیلت ''غلبہ، قوت

اور اثر'' کے معنی میں ہے۔ جو شے کسی دوسری شے پر فعل کرتی ہے وہ اسی وجہ سے تو کرتی ہے کہ وہ اس پر غالب ہے، اس کے مقابلے میں طاقت ور ہے اور اس پر اثر کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ اور جو ''شے'' اس کے فعل کو قبول کرتی ہے وہ مغلوب ہے تو ایسا کرتی ہے۔ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ مولانا عورت کو ایک شے کے مشابہ قرار دے رہے ہیں۔ یہاں ہم اس بات کی تردید کرنا چاہتے ہیں، کہ کوئی بھی جدید سائنس اور تحقیق مولانا کے فاعل اور مفعول کے فلسفے کو نہیں مانتی۔ بچے کی پیدائش کے عمل میں عورت اور مرد اپنی اپنی جگہ پر فاعل کا فریضہ ہی ادا کر رہے ہوتے ہیں، بلکہ عورت کا ''فاعلی'' کردار مرد سے کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ جنسی عمل میں مرد عورت پر عمل پیرا ہوتا ہے، یا اسے کچھ ''دیتا'' ہے، بلکہ دونوں مساویانہ عمل میں شریک ہوتے ہیں۔

یہ طے کرنے کے بعد کہ عورت کا بنیادی فریضہ خانہ داری، بچوں کی پیدائش و تربیت اور خاوند کی جسمانی ضروریات کو پورا کرنا ہے، پھر وہ عورت کے لباس اور ستر کے حدود مقرر کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ کلامِ مقدس کی روشنی میں نقاب اور برقع اوڑھنے کی سختی سے حمایت کرتے ہیں۔ صرف ناگزیر حاجت اور ضرورت میں ہی چہرہ کھولنے کی اجازت ہے اور یہ بھی اس لیے ہے کہ اسلام انتہا پسند مذہب نہیں! البتہ یہ سوچنا باقی ہے کہ اس اعتدال اور انتہا میں فرق کتنا باقی رہ گیا ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ پھر عورت کے باہر نکلنے کے ''قوانین'' بنائے جاتے ہیں۔ اس میں پہلا حکم خداوندی یہ ہے کہ ''اپنے گھروں میں (وقار کے ساتھ) بیٹھی رہو۔۔۔ مردوں کے ساتھ بات کرنے میں درشت لہجہ استعمال کرو۔'' نرم لہجے میں مرد کہیں لٹو ہی نہ ہو جائیں۔ اگر عورت کو پاکیزہ کام کے لیے پاکیزہ جگہ جانے کی عام اجازت نہیں، تو اسلام کسی سماجی کام کے لیے عورت کو باہر جانے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟ اسے تو اپنے کسی عزیز ترین رشتے دار کے جنازے میں شریک ہونے کی اجازت نہیں۔ احتیاط کا یہ عالم ہے کہ سو سال کی بوڑھی عورت سو سال کے بوڑھے نامحرم مرد کے ساتھ حج نہیں کر سکتی۔ اس کے بعد مولانا کہتے ہیں یہ ہے وہ ''عدل اور نقطۂ توسط'' جس کی ساری دنیا کو ضرورت ہے!

مندرجہ بالا معروضات کے بعد ہم عرض کرنا چاہیں گے کہ کچھ مسلم دانشور اور علما مولانا کے موقف سے اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام اتنی زیادہ سختی کی اجازت نہیں دیتا اور عورت آج کی دنیا کے تقاضوں کے مطابق فرائض ادا کر سکتی ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ جو مولانا مودودی اور دیگر مذہبی پیشواؤں کا خیال ہے وہی اسلام کا صحیح موقف ہے۔ اسلام میں عورت کی خودمختار حیثیت کا کوئی تصور نہیں۔ یہ سوچنا ہم سب کا کام ہے کہ کیا مذہب آج کی معاشرت، ضروریات، اور آج کے انسان کے شعور کا ساتھ دے سکتا ہے؟ مذہبی تعلیمات ایک قدیم اور قبائلی معاشرت کا پرتو ہیں۔ وہ جدید ترقی یافتہ اور سائنسی تہذیب میں ہرگز فٹ نہیں ہو سکتیں۔ اگر اس کا نفاذ کرنا ہے تو پہلے جدید تہذیب اور آج کے شعور کو برباد کرنا ضروری ہے۔ ہمارے سامنے افغانستان کے طالبان کے مثال موجود ہے کہ اصلی مذہب اجڑی بستیوں اور کھنڈرات پر نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اگر آج کی عورت اپنی ذات کی ہمہ پہلو ترقی چاہتی ہے، خود کو انسان کے طور پر منوانا چاہتی ہے، فطری اور ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے اپنی ذات اور زندگی کے بامقصد ہونے کا روحانی احساس حاصل کرنا چاہتی ہے، سماجی ترقی اور تہذیب کی ترقی میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتی ہے، اسے اگر حقیقی خوشی درکار ہے تو پھر ہمیں مذہب کے رول کو اپنی اجتماعی زندگی میں محدود کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ مذہب انسان کی اندر کی کمزوریوں کی تسکین تو کر سکتا ہے، اسے کچھ پریشان سوالوں سے چھٹکارا تو دلوا سکتا ہے، اس کے لیے کچھ روحانی سکون کا باعث تو بن سکتا ہے، لیکن تہذیب کی راہنمائی کے لیے ہمیں خود اپنی عقل، شعور اور عملی تقاضوں کی ضرورت بھی ہوگی۔